DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

اوراق بصیرت افروز

کانفرنس نمبر

جلد دوم

۱۹۷۶ء

مدیرہ:-

ڈاکٹر آمنہ خاتون

صدر شعبۂ اردو

گیان بھارتی، بنگلور یونیورسٹی

ناشر: ڈاکٹر آمنہ خاتون
۱۴/۲ تھرڈ کراس لال باغ روڈ بنگلور ۲۷

قیمت: سوا گیارہ روپیہ

مطبوعہ: نفیس پریس
26/1، ہینس روڈ بنگلور ۱

ملنے کے پتے:

۱. یونیورسٹی بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲. مکتبہ جامعہ۔ اردو بازار۔ دہلی
۳. ڈاکٹر آمنہ خاتون
۱۴/۲ تھرڈ کراس لال باغ روڈ بنگلور ۲۷

گرامی قدر ہز ایکسلنسی عالی جناب

اوما شنکر دکشٹ صاحب

گورنر ریاست کرناٹک

کے

نام

جن کا یہ قول زندگی کے حاصل کا مقام رکھتا ہے کہ
"زندگی کا ایک مقصد ہو پھر اس کی کار برآری
میں پوری لگن اور خلوص صرف ہو۔ بس خوشی اور
خوش حالی اس کی اپنی ہے"

فہرس

پیش لفظ

ہندوستان جنت نشان کے حالات بدل چکے ہیں۔ ہر فرد بلکہ ہر ذرہ توانا بن چکا ہے، نئے خیالات اور نئی طرز زندگی کو اپنانے کا حوصلہ بیدار ہو چکا ہے۔ مایوسی کم ہوتی جا رہی ہے، اور ترقی کی راہ پر چلنے کا شوق بڑھ چلا ہے، اردو داں، اور اردو نواز بننے میں فخر محسوس ہو رہا ہے، سال کے شروع میں ایم۔ اے اردو میں قواعد داخلہ کی کسی پابندی کی وجہ سے داخلے نہیں ملتے ہیں تو حالت دیدنی ہوتی ہے، طالبات بار بار دفتر کا چکر کاٹنے کے بعد آنسو بھری آنکھوں سے جب پوچھتی ہیں کہ کیا ہمیں اردو ایم۔ اے میں داخلہ نہیں ملے گا، کیا آپ کا یہ کہنا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور اردو میں اول درجے کے نمبر لے چکے ہیں، ہمارے حق میں وکالت نہیں کرے گا، تو میری روح کانپ اٹھتی ہے، زبان لڑکھڑا جاتی ہے، حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ دل صدا دیتا ہے کہ یہ شدید جذبہ یہ سچا احساس اردو کی زندگی کا ضامن ہے اس کی حفاظت ہونی چاہئے، یہ دنیا کا حصول نہیں ہے، اردو سے والہانہ محبت ہے، اردو کے ایسے فدائی ملک کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔

انجمن اساتذۂ اردو، جامعات ہند ایک ہندوستان گیر انجمن ہے، اور کل ہند تنظیم کی صورت میں اس کی رجسٹری بھی ہو چکی ہے، یہ اردو کے وقار کو برقرار رکھنے، علمی وزن کو بڑھانے اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کے لئے وجود میں آئی، اس کارگاہ کی تعمیر اساتذہ نے کی، اس کی ترقی اساتذہ کی جد و جہد ان کے جوش و خروش، ان کے حوصلے اور عمل پر موقوف ہے، ۱۹۶۶ میں پہلی کانفرنس دہلی میں ہوئی، چھٹی کانفرنس ۱۹۷۶ء میں پورے دس برس بعد بنگلور میں ہوئی، ہر کانفرنس میں اساتذہ بڑے بڑے منصوبوں اور آرزوؤں سے شریک ہوتے رہے، انجمن ہندوستان گیر نصاب کا خاکہ بنانے میں ممد ہو

تحقیق کی نگرانی کے لئے چند برگزیدہ محققوں کی کمیٹی تشکیل دے گی، پورے ملک کے باصلاحیت رہنمایان تحقیق کی فہرست یونیورسٹیوں میں بھیجنے کے لئے مرتب کرے گی۔ انجمن تحقیقی رسالہ شائع کرے گی، ڈراما کی تاریخ مدون کرنے میں مدد دے گی، وغیرہ وغیرہ، منصوبے ہمیشہ خوبصورت اور کارآمد معلوم ہوتے ہیں مشکل تو یہ ہے کہ اساتذہ کسی یونیورسٹی میں کانفرنس کا انعقاد کر لیتے ہیں تو یہی ان کا کارنامہ بن جاتا ہے، سال بھر کی تعلیمی کارگزاریوں کے پیش نظر ان کے پاس اتنی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے کہ کانفرنس میں جو تجویزیں پاس ہوئیں اور جو پروگرام بنے ان کے بارے میں دریافت کریں کہ کیا ان پر عمل بھی ہوا، یا عمل برآری کے لئے کیا اقدام کئے گئے، حقیقت تو یہ ہے کہ ضابطے کی رو سے دو سال میں ایک دفعہ انجمن کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے، مجلس عاملہ کے ممبر یہ پوچھتے ہی رہ جاتے ہیں کہ ان کے فرائض منصبی کیا ہو سکتے ہیں، کام دیا جاتا ہے نہ کام لیا جاتا ہے، صرف اس کا انتظار ہوتا ہے کہ پھر کہیں کانفرنس کا اہتمام ہو پھر عہدیدار اپنے آپ کو عہدیدار سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ ادھر کانفرنس ہوئی ادھر لوگ کہنے لگے کہ اس کی کل کائنات اس سے بڑھ کر نہیں کہ ع نشستند و گفتند و برخاستند۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ ایک سماجی اجتماع تھا، ہمارے محسن اعظم سر سید کے الفاظ میں انھیں یہ کون سمجھائے کہ "وہ اٹھے، وہ کلبلائے، خدا نے چاہا تو اب سمجھدار بھی ہو جائیں گے"۔ یہی درست۔ وہ تمیز "ہماری قوم کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی، اب کسی نہ کسی طرف بہہ نکلے گا۔ لوہا پگھلا تو سہی اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا، بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا، پانی کو بہنا چاہئے، پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ نکال لے گا۔"

ضرورت ہے کہ آج کے سے سازگار حالات میں انجمن اساتذۂ اردو کو ہندگیر انجمن کے ساتھ ایک ہندگیر تحریک بھی بنا دیا جائے، اس کے تانے بانے میں اردو سے والہانہ محبت رکھنے والے طلبہ اور دانشور موجود ہیں، ان فدائی عناصر کی تلاش کرنے اور ان سے عملاً کچھ نہ کچھ کام لینے کی ضرورت ہے، یہ

اسی وقت ممکن ہے کہ انجمن ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے کام کرے۔ اس کا اپنا واضح لائحہ عمل ہو، خلوص اور لگن سے کام کرنے والا سکریٹری اپنے عملے کے ساتھ موجود ہو، جس کے ہر قول کا ثبوت عمل ہو، ملک کے ہزاروں اردو کے لاتعداد اساتذہ درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ ان کے شعور کو بیدار کیا جائے گا، وہ محسوس کریں کہ اردو کی ترقی اور تحفظ کے لئے کام کرنا ان کا اپنا اخلاقی فرض ہے، ذاتی ترقی اور تحفظ ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ "یہ ثابت کریں گے کہ اردو عالمی سطح پر ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے، تب ہی تحقیقی اور تعلیمی مسائل میں معیار برقرار رہ سکتے ہیں، تحقیق کی کمی کسی حد تک ختم ہو گی، حوالے کی کتابیں ملیں گی، نوجوانوں کو پروان چڑھانے اور پرورش کرنے کا موقع ملے گا، معیاری نصابی کتب ہر درجہ کے لئے آسانی سے تیار ہو سکیں گی، اور نوکریوں کے مسائل کے بارے میں صحیح اطلاعات ہندوستان گیر پیمانے پر فراہم ہوں گے۔

اردو کی ترقی کے لئے ریاست ریاست میں اردو اکیڈمیاں بن رہی ہیں، ہندگیر سطح پر ترقی اردو بیورو اور انجمن ترقی اردو، اردو کی ترقی و ترویج میں کام کر رہے ہیں۔ اگر اساتذہ کا طبقہ بھی فعال ہو جائے اور ہندگیر تحریک اور تنظیم کے تحت کام کرے تو علمی اور عوامی دونوں سطحوں پر ٹھوس اور قابل قدر کام ہو سکتا ہے۔

خلوص اور لگن سے کام ہوتا ہے تو مالی وسائل کا فراہم ہونا دشوار نہیں ہے، بورڈ، اسمبلی، ریاستی حکومتیں، ادارے اور نجی اشخاص ضرور مدد کرتے ہیں۔ وقت کی آواز پر بھی لگن سے کام ہوتے ہیں تو اچھے نتیجے بھی ہاتھ آتے ہیں۔

ریاست کرناٹک کے ایک ضلع شیموگہ میں متوازی اردو ایکشن مارچ ۱۹۔۔ کی مردم شماری کے موقع پر قائم ہوئی اس نے محلے محلے کے اردو بولنے والوں کے اعداد و شمار ان عنوانوں کے تحت جمع کئے: (۱) جملہ مکانات (۲) ان کی کل آبادی (۳) ذاتی مکانات (۴) کرایہ کے مکانات (۵) ہر مرکز مرد

(۶) بے کار عورتیں (۷) بیوائیں (۸) پانچ سال سے کم عمر کے بچے، (۹) پانچ سے پندرہ سال عمر والے (۱۰) اسکول جانے والے (۱۱) اسکول چھوڑے ہوئے (۱۲) نوجوان، وغیرہ وغیرہ۔ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ اس سے صرف اردو زبان بولنے والوں کی تعداد ہی مہیا نہ ہوگی، ان کے مذہبی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل بھی منظر عام پر آئے۔ اسی تنظیم کے تحت ملت ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے سینکڑوں اردو نرسری اسکول چلائے جا رہے ہیں، جس میں بیسیوں اساتذہ برسر روزگار ہیں اور اس تنظیم کے تحت دوسرے ضلعوں میں بھی نرسری اسکول قائم ہوتے جاتے ہیں۔

اردو ہندوستان کی بڑی اقلیت کی زبان ہے، اس کا اپنا کوئی علاقہ نہیں، یہ کسی اسٹیٹ کی نہ ہوتے ہوئے بھی ہر اسٹیٹ میں بولی سمجھی اور برتی جاتی ہے۔ اگر انجمن اساتذہ اردو کا ایک ذیلی شعبہ خاص اس مقصد کے لئے کام کرے کہ ملک کے گوشے گوشے سے اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کے اعداد جمع کرے، ان کی بولیوں کے نمونے فراہم کرے، اردو کے ماضی اور حال کی تفصیلات اور تحریری نمونے جمع کرے تو اس سروے سے اردو سے متعلق آگاہی کا بیش بہا خزانہ ہاتھ آئے گا، اردو کے ذخیرہ الفاظ اور ذخیرۂ ادب میں اضافہ ہوگا، جامع تاریخ ادب اردو کے مدوّن کرنے میں سہولت ہوگی۔

اکثر و بیشتر یہ بات علم میں آتی رہی ہے کہ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی جب بھی کانفرنس ہوتی ہیں تو پبلک بلکہ اردو کے حرف شناس اور اردو سے سرسری واقفیت رکھنے والے بھی تمنا کرتے ہیں کہ کانفرنس کی کارروائیوں میں انھیں شرکت کا موقع ملے، اور وہ بھی اپنی صلاحیتوں کو دوسروں پر ظاہر کریں اور دوسروں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں، ان صاحبوں کی اردو دلچسپی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اردو کے مسئلوں کو حل کرنے اور انھیں آگے بڑھانے کی غرض سے ان سب کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے، یہ دامے، درمے، قدمے ہر طرح مدد کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں، انجمن کا ایک ذیلی شعبہ خاص اسی غرض سے قائم ہو کہ ایسے عوام کو حسب استعداد مواقع فراہم کرے تو اردو کے حق میں مفید

نتائج فراہم ہوں گے۔

بڑے تلخ تجربوں کے بعد ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی لکھتے ہیں، "یہ درست ہے کہ اس وقت اردو کی بقا کا مسئلہ ہے اور اس وقت معیار بندی اور معیار سازی سے زیادہ، اس کی بقا کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی نچلے سے نچلا معیار ہے جہاں ہم ٹھہر سکتے ہیں، اگر ثانوی درجات سے گزرنے کے بعد اور کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر آکر بھی زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ جملے غلط لکھے جاتے ہیں، املا کی غلطیاں ہوتی ہیں، مربوط عبارت نہیں لکھی جا سکتی ہے، اظہار خیالات پر قدرت نہیں ہے، ادب کی تفہیم نہیں پیدا ہوتی ہے تو اس کا کیا اور کس طرح تدارک کیا جا سکتا ہے، یہ مسئلہ اگر نظر انداز ہوا تو تحقیق و تنقید کی عمارتوں کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہوتی چلی جائیں گی۔"

ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی استاد ہیں، اور استاد حاذق، وہ ممتحن بھی ہوتے ہیں، امتحان دینے اور لینے والوں کی کل افتادوں سے کماحقہ واقف بھی ہیں، انھیں غلط جملے دیکھنا پڑتا ہے، املا کی غلطیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ "ادب پھر بھی فن ہے وہ اجتماعی زندگی کی اتنی بڑی لہر نہیں جتنی کہ زبان" وہ نادانستہ غلطیوں کو معاف کر دیں گے لیکن یونیورسٹیوں اور کالجوں کی سطح پر پہنچ کر کوئی ایسی بدعنوانیاں یا جہالت برتتا ہے تو وہ مجرم ہے، ایسے سہل انگار اور ناواقف کار سے تحقیق و تنقید کی عمارتوں کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی جائیں گی۔

ڈاکٹر محمد حسنین پروفیسر مگدھ یونیورسٹی بھی املا کی دشواری کو محسوس کرتے ہیں لیکن ان کا مسئلہ غیر اردو داں اردو پڑھنے والوں سے ہے، وہ خوش بھی ہیں کہ رشید حسن خان کی گراں قدر تصنیف "اردو املا" کے ہوتے اردو املا کے انتشار پر قابو پانا دشوار نہیں، لکھتے ہیں:-

"دراصل اردو پڑھنے والوں کی دشواری اس کا رسم خط نہیں"

اس زبان کا املا ہے، بچہ ہو یا سیانا، ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، اردو سیکھنے میں اس زبان کے املائی انتشار سے فوراً دو چار ہوتا ہے اور بری طرح الجھتا ہے اس کی پہلی مصیبت کسی لفظ کو رسم خط کے بہ ... جب صحیح طور پر لکھنا اور پڑھنا ہوتی ہے ...... اس ضمن میں وزارت تعلیم حکومت ہند کا اردو ترقی بورڈ قابل ستائش ہے کہ املا کے انتشار پر قابو پانا اب ہمارے لئے دشوار نہ رہا، میری مراد رشید حسن خان کی گراں قدر تصنیف کی اشاعت ہے، اردو املا کی صحت اور سلامتی کے لئے یہ بروقت سبیل نہایت مفید ثابت ہوگی۔"

پروفیسر حسینی ان اردو پڑھانے والے اساتذہ سے سروکار نہیں رکھتے جو "اردو املا" کے ہوتے املائی غلطیوں سے بچ نہیں سکتے،

پروفیسر حسرت سہروردی پُر زور سفارش کرتے ہیں کہ وہ تمام ادارے اور انجمنیں جو اردو کے لئے کام کر رہی ہیں "اردو املا" کی سفارشات کو اپنائیں، خصوصیت کے ساتھ آج کا اردو پریس۔ لکھتے ہیں:-

"ہماری زبان کا املا بڑا ہی پُر پیچ اور مشکل ہے، اس کے املائی بھول بھلیوں سے جہاں اہل زبان خود آسانی سے نہیں نکل سکتے تو بھلا وہ لوگ جو زبان سے بالکل ناواقف ہیں وہ کیسے اس ہفت خواں کو سر کر سکیں گے، اس مد میں ہمارے چند احباب کی کوششوں کو نہ سراہنا ایک ادبی کفر ہے۔ قاضی عبدالستار مرحوم نے سب سے پہلے اس پر سائنٹفک انداز سے سوچا، ان کی سوچ کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے، ان کے بعد ابھی ابھی رشید حسن خان نے املا نامہ لکھ کر بہت سے مسائل کا حل پیش کیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ تمام ادارے اور انجمنیں جو اردو کے لئے کام کر رہی ہیں ان سفارشات کو اپنائیں، خصوصیت سے آج کا اردو پریس۔"

"کانفرنس"، شعبۂ اردو بنگلور یونیورسٹی کی طرف سے منعقد ہوئی بنگلور یونیورسٹی کے محبوب اور مقبول وائس چانسلر ڈاکٹر ایچ، نرسمہیا نے مکمل تعاون فرمایا۔ اس کانفرنس کی یہ خاص خوبی رہی کہ آئے ہوئے اساتذہ میں کے چند شاعروں نے وائس چانسلر صاحب سے بہت اچھا تاثر لیا اور اپنے

خاص خاص رنگ میں عمدہ سے عمدہ شعر بھی کہے، میں نے ان نظموں کا تین زبانوں۔ اردو، انگریزی اور کنڑی - میں ترجمہ کرا کے پی۔ نرسمہیا کے دوبارہ وائس چانسلر کے تقرر پر مبارک باد کے طور پر پیش کرنے کے لئے "ارمغان" کے نام سے شائع کیا۔ قدردانوں نے اس کو بہت سراہا - چنانچہ ڈاکٹر مدنّا صاحب لکھتے ہیں :-

6561 I Stage
Indiranagar
Bangalore - 38
Dt. 17/7/76

محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ

آداب عرض ہے، آپ نے جو سات نظمیں کنڑی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے مجھے دی تھیں، ان نظموں کو جس کسی نے مجھ سے سنا بے حد پسند کیا، کیونکہ میں نے کنڑی زبان کی ساری شیرینی کو اس میں سمو دینے کی کوشش کی ہے جو اردو نظموں میں، میں نے پائی۔ جب آل انڈیا ریڈیو کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ راجمّا صاحبہ کو پتہ چلا تو انہوں نے ان کنڑی نظموں کو دیکھا، اور اس قدر سراہا کہ میں بیان نہیں کر سکتا، اور مجھ سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں اس کو کنڑی پروگرام میں شامل کروں تاکہ کنڑی داں طبقے کو پتہ چلے کہ اردو شاعری کا انداز فکر کیا ہے۔ اور ان کی پرواز تخیل کا کیا حال ہے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس طرح کا کام قومی یکجہتی کے لئے سنگ میل ثابت ہوگا۔ دراصل اس کی محرک آپ ہی ہیں، اور صحیح معنوں میں آپ ہی مستحق مبارکباد ہیں کہ قومی یکجہتی کے لئے ایک نئی راہ نکالی، آپ کے اس اقدام سے شاعر حضرات ضرور خوش ہوں گے کہ آپ ہی کی وجہ سے اردو شعراء کنڑی دانوں سے روشناس ہو رہے ہیں، خلوص آگیں

منظر

۱۷/۷/۷۶ (Dr. K. Muddanna)

اساتذہ جن کے اشعار "ارمغان" میں درج ہیں:-

(۱) ایم۔ عشاء الرحمن خان، گن وان نہ سمجھیا، اظہار حقیقت، اظہار تشکر۔
(۲) منظر عباس نقوی۔ تشکریہ، روشنی کا شہر بنگلور۔
(۳) جاوید وششٹ۔ میکدہ اور ساقی (۴) تنویر احمد علوی۔ یہ ثنائے شہر بنگلور بہ زبان فارسی۔ لائق اساتذہ اور نامور ادیبوں اور شاعروں کا یہ بین کرناٹک کا یہ سب سے پہلا اور بڑا اجتماع ہے، اس کے مقالے بھی مختلف موضوعوں کے اساتذہ نے بڑی دیدہ ریزی اور غور و فکر سے تیار کئے ہیں اور کانفرنس کے موقع پر میں نے ان سب کو جمع کر لیا تھا۔ اس لئے گوارا نہ ہوا کہ یہ مقالے رکھے رکھے ضائع ہو جائیں۔ میں نے شعبے کے اس رسالے "اوراق ادبیت افروز کانفرنس نمبر" میں انہیں شایع کر دیا تاکہ کانفرنس اور اس کے مقالے یادگار ہو جائیں اور صاحب نظر انہیں پڑھیں اور غور و فکر کریں۔ دو ایک اشتہاروں کے سوا اس کی طباعت اور اشاعت کا سارا خرچ میں نے خود برداشت کیا ہے، اس گرانی کے زمانے میں اور پریس میں غیر معمولی تاخیر کی وجہ سے اس پر کافی روپیہ صرف ہو گیا اس لئے اس کی قیمت بھی مقرر کر دی۔

کانفرنس کے زمانے میں جناب قدیر امتیاز صاحب لکچرر اور فائنل ایم۔ اے کے طالب علموں۔ خصوصیت سے جناب سید مشتاق احمد اور جناب نور اللہ شریف۔ نے میری بڑی مدد فرمائی، میں ان کا شکرگزار ہوں۔ میرے صاحب مولوی محمد خان نے "اساتذہ شعراء" کے اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر بنگلور کے خوبصورت ٹاؤن ہال میں ۲۸ اکتوبر کی رات میں مشاعرے کا اہتمام کیا، مشاعرے کو یادگار بنانے کی غرض سے ایک سووینیر بھی شایع کیا جس میں انتالیس شاعروں کے خود نوشتہ حالات درج ہیں۔ بنگلور کے ایک اور سابق یادگار مشاعرے "شام اودھ" کی روداد چھپی ہے، میں نے اس مشاعرے کا انتظام ۲۲ فروری ۱۹۷۳ء میں کیا تھا، اس کے علاوہ میرے دو مضمون بھی شامل ہیں: (۱) اردو کی تعلیم اور تدریس کے مسائل (۲) کمیٹی برائے فروغ اردو کی خدمت میں میرے معروضات۔

سووینیر کا اجراء میسور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر محمد رحمت اللہ شریف صاحب نے فرمایا۔ اور مشاعرے کی صدارت عالی جناب حبیب رشاہ صاحب ایم ایل سی نے کی۔ اور اپنی صاف اور شستہ اردو میں بڑی اچھی تقریر کی جس کو مدعو اساتذہ شعراء نے نہایت پسند کیا۔ اور یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ بنگلور جیسے دور دراز مقام میں بھی ایسے اصحاب ہیں جو اردو میں بے تکلف تقریر کر سکتے ہیں۔ اساتذہ شعراء کا کلام بلند پایہ اور مرصع ہونے کی وجہ سے نہایت پسند کیا گیا۔ سامعین نے جی کھول کر داد دی۔ یہ مشاعرہ ریکارڈ ہو چکا ہے اس کی پوری تفصیل دی جا سکتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے بچوں نے اس پر غلطی کا نے ریکارڈ کر دیئے۔ اسی لیے صرف وہ کلام جو شاعران کرام سے استدعا کرنے پر فراہم ہو سکا۔ شاعروں کے نام کے ساتھ پیش نظر مجلے کے صفحہ ۱۶۸ سے شروع ہوتا ہے۔

بنگلور یونیورسٹی کے نئے کیمپس گیان بھارتی میں کانفرنس کے مندوبین کے قیام و طعام اور سینیٹ ہال میں کانفرنس کے نشستوں کا انتظام ہوا تھا۔ کانفرنس کے بعد بنگلور کی پبلک کو نہایت درجہ خواہش ہوئی کہ کانفرنس کے بارے میں مندوبین کے تاثرات جانیں۔ ہم نے ان تاثرات کے بارے میں جتنی تحریریں خطوط کی شکل میں وصول ہوئیں انھیں شائع کر دیں۔

کانفرنس کے اجلاسوں میں جو مقالے پڑھے گئے۔ پریس کی کچھ مشکلات کی وجہ سے ان کی ترتیب باقی نہ رہ سکی۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ قارئین کرام ان کا ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے کانفرنس کی جو روداد لکھی ہے اس کے مطابق مطالعہ فرمائیں۔

فقط

اساتذہ کے اسمائے گرامی جن کے حالات سووینیر میں شائع ہوئے ہیں :۔

سید محمد حسنین، آمنہ خاتون، ظہیر احمد صدیقی، قمر رئیس، اشفاق احمد اعظمی، ذکیہ انجم، احمد لاری، ذرینہ ثانی، مرزا محمد زماں آزردہ، راہی قریشی، محمود الہیٰ، محمد عبد القدیر، فہمیدہ بیگم، محمد علی ہاشمی، احتشام حسین پاشا، سید حیدر عباس رضوی،

آفاق حسین صدیقی، سید صفی اللہ، عبد الودود، محمد وسیم الدین، محمد مجاہد خان، ایم محمد ابراہیم، عبد القوی دسنوی، نظام الدین ایس گوریکر، محمد علی نذیری، سعیدہ شریف قادری، جیلانی میاں پیر صاحب میاں قادری، گیان چند، شیام لال کالڑا، ظہور الدین، مختار احمد شمیم، م۔ ن۔ سعید، ایس ایم نعمانی، محمد انصار اللہ، حنیف احمد مشیر، ایس غلام رسول، جعفر رضا، اخلاق اثر، مقبول احمد صدیقی۔

گرامی قدر ہز ایکسلنسی عالی جناب اوما شنکر دکشت صاحب گورنر ریاست کرناٹک کی نہایت شکر گذار ہوں کہ میں جب ۱۰ر نومبر ۱۹۷۶ء کی شام ۵ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے اساتذہ اردو جامعات ہند کی چھٹی کل ہند کانفرنس منعقدہ بنگلور کے کانفرنس نمبر کو آپ کے اسم گرامی سے معنون کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے کانفرنس نمبر کی قدر و قیمت اور اہمیت کے بارے میرے خیالات سنے اور خوشی سے اس نمبر کو آپ کے نام نامی سے معنون کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ پھر میں نے ارمغان،، (کانفرنس کے زمانے میں ڈاکٹر تنزیر احمد علوی، ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشاء، جناب جاوید وششٹ اور ڈاکٹر منظر عباس نقوی کی وہ نظمیں جو ہمارے وائس چانسلر ڈاکٹر ایچ نرسمہیا سے متاثر ہو کر لکھی گئیں اور جنھیں میں نے تین زبانوں کنڑی، اردو اور انگریزی میں ترجمے کے بعد چھپوایا ہے اور ارمغان،، کے نام سے اس کانفرنس نمبر کے اجراء کے موقع پر ہمارے وائس چانسلر کو ان کے دوبارہ وائس چانسلر کی حیثیت سے مقرر ہونے کی خوشی میں مبارکباد کے طور پر پیش کیا ہے) آپ کی خدمت میں پیش کیا اور اس کی اردو نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ آپ نے نہایت غور اور خوشی سے ان کو سنا اور فرمایا کہ ڈاکٹر نرسمہیا صاحب سے میں بھی پیار کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے گورنر صاحب کی ان نوازشوں سے میں بہت ممنون ہوئی۔

اس کانفرنس نمبر کی خوبی یہ ہے کہ جس کے مطالعے میں یہ نمبر آئے گا کانفرنس کی کل کارروائی کی ایک تفصیلی رپورٹ ان کی نظر میں آجائے گی۔ اس طرح کی کوئی کوشش اس سے پہلے وجود میں نہیں آئی۔

میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں کہ میرے لڑکے محمد امین خان کی میری والدہ مرحومہ کے اصرار پر فوری شادی، پھر والدہ محترمہ کا انتقال اور مطبع میں تاخیر کی وجہ سے کچھ مضامین کے صفحے ادھر ادھر رہ جانے کی وجہ سے قارئین کرام کو فہرس کے صفحوں کے مطابق مضامین پڑھنے ہوں گے۔ امید قوی ہے کہ قارئین کرام ضرور مجھ پر احسان کریں گے۔

فقط

آمنہ خاتون
صدر شعبۂ اردو
گیان بھارتی۔ بنگلور یونیورسٹی

مورخہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۶ء
بنگلور

Participants of VI All India University Urdu Teachers Conference

26-28 October 1975



Sitting-L to R: Dr. Sharib Rudowlvi-Delhi, Dr. Abdul Haq-Delhi, Sri. Javed Vashist-Delhi, Dr. Amina Khatoon-Bangalore, Dr. Qamar Rais-Delhi, Mrs. Roshan Muhammed Hasan-Delhi, Dr. H. Narasimhaiah Vice Chancellor, Bangalore University, His Excellency Janab Mohanlal Sukhadia, Governor of Karnataka (Now Governor of A.P) Dr. Muhammed Hasan-Delhi, Dr. Qazi Abdus Sattar-Aligarh, Dr. Shyam Lal Kalra. Abid Peshawari-Jammun, Dr. Shahid Husaini - Hyderabad, Dr. Nizrmuddin Gorekar-Bombay, Dr. Azhar Rahi-Ujjain, Dr. Afsah Zafar-Bodh Gaya

Standing I Row : L to R Dr. Tayab Abdali-Bodh Gaya, Dr. Wahab Ashrafi-Bodhgaya, Dr. Ahad-Nalgonda, A. P. Dr. Raziuddin-Tirupati, Dr. Zuhooruddin-Jammu, Dr. Manzar Azami-Jammu, Dr. Mohammed Hasnain-Bodhgaya, Dr. Sargu Krishnamoorthy-Bangalore, Dr. Asghar Abbas-Aligarh, Dr. Mohemmed Hamid Chapravi-Bihar, Dr. Ather Parviz-Aligarh, Janab Ghulamjeelani-Delhi, Mirza M. Zaman Khan Azurdah-Jammun, Abid Siddiqia Hyderabad, Dr. Unwan Chishti-Delhi, Dr. Hashim Ali-Mysore, Janab Anisul Haq-Bangalore, Dr Abdul Wadood-Bhopal, Janab Wahidunnisa - Bangalore, Dr. Fahmida Begum - Bangalore.

Standing II Row : Dr. Tenvir Ahmed Alavi-Delhi, Janab Riaz Ahmed-Bangalore, Dr. Sadid Razvi-Udaypur, Janab Haneef Kaifi-Delhi, Dr. Jafar Raza-Allahabad, Janab Mohiuddin Bombaywala-Ahmedabad Dr. Najmul Huda-Bihar, Janab Mohammed Ibrahim-Bangalore, Dr. Manzar Abbas Naqvi-Aligarh, Dr. Atiq Ahmed Siddiqi-Aligarh, Dr. Sheen Akhter-Ranchi, Dr. Abu Zir Usmani, Dr. Kamil Quraishi-Delhi Dr. Zamir Hasan-Delhi, Janab Abidunnisa-Bangalore, Janab Naima Begum-Mysore.

Standing III Row: Dr. Safia Hairat Bangalore, Dr. Zarina Sani-Nagpur, Janab A. L. Azazi-Delhi, Janab Mohammed Usman Topina Kutti-Belgaum, Dr. Sharif Ahmed-Delhi, Dr. Shehab Jafari-Delhi, Dr. Zilie Hasnain-Allahabad, Janab Mushtaq Ahmed-Mysore, Dr. Mudammed Mansha ur Rahman Khan, Mansha-Nagpur, Janab Mohammed Haneef-Mysore, Janab Md. Hafizulla-Shariff-Student-Bangalore, Janab Mrs. Qaderi-Ahmedabad, Janab Mrs. Uraizee-Ahmedabad, Janab Qudratulla-Kerala, Janab Abdul Kareem Timmapuri-Bangalore, Dr. Sadicur Rahiman Kidwai-Delhi, Janab Riaz Iqbal, Janab Noorjahan Sarwat-Delhi, Dr. Zakia Anjum-Delhi.

Standing IV Row. Janab Qadeer Imtiaz-Bangalore, Janab Abdul Hamid, Studint-Bangalore etc etc.

قمر رئیس

۱۴ ؍ نومبر ۷۵ء
دہلی

محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ!

آپکا 8 ؍ نومبر کا مکتوب ملا۔ شکر گذار ہوں۔

میں راستہ ہی میں علیل ہوگیا تھا۔ دہلی پہنچ کر سخت بیمار ہوگیا۔ فلو کا حملہ تھا۔ شکر ہے کہ اب روبصحت ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے بے حد شرمندگی ہے کہ آپ کو اپنے تاثرات نہیں لکھ سکا اور آپکی زحمتوں کے لئے شکریہ بھی نہیں ادا کر سکا۔ ادھر چند روز سے قراردادوں کے ترجمہ اور دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے وائس چانسلر اور دوسرے حضرات کو شکریہ کا خط لکھ دیا ہوگا۔ لیکن پرسوں معلوم ہوا کہ انھوں نے نہیں لکھا۔ میں آج شکریہ کے خط بھی پوسٹ کر رہا ہوں۔ وائس چانسلر اور محمد علی والے خطوں کی نقلیں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

کانفرنس ہر لحاظ سے بے حد کامیاب رہی۔ اتنے مندوبین نے اس سے پہلے کسی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ تمام مندوبین مطمئن اور خوش تھے۔ قیام و طعام کا آپ نے معقول انتظام کیا تھا۔ کچھ کوتاہیاں معمولی سی ضرور رہیں۔ لیکن یہ کس اجتماع میں نہیں ہوتیں۔ پھر ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ آپ سب کچھ تن تنہا کر رہی تھیں۔ ایک دو کے علاوہ اچھے والنٹیرس کی کمی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے تنہا اپنی ذمہ داری پر اتنا بڑا اجتماع کر ڈالا۔ یہ آپکی ہمت، اردو دوستی اور خوش انتظامی کی دلیل ہے۔ قدیر امتیاز، انیس الحق، ڈاکٹر فہمیدہ صوفیہ حشمت اور آپکے تمام اعزا بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تین چار دن بے پناہ محنت کی اور مندوبین کی آسائش و آرام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

کانفرنس کی مختصر روداد شمال اور جنوب کے تمام اخباروں کو بھیج دی گئی ہے۔ ہماری زبان اور دوسرے اخباروں میں، آج کل میں شائع ہو جائے گی۔ تفصیلی روداد دسمبر میں خبرنامہ میں آئے گی۔

تصویر ابھی آئی ہے۔ نام لکھ کر بھیج رہا ہوں بہت سے چہروں کو میں بھی پہچان

نہیں سکا۔ وہاں سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ بس اسی طرح چھپوا دیجئے۔ تصویر مقامی حضرات کو دیکھنے کے لئے بھیج دی ہے جو حضرات فوٹو کی کاپی منگوانا چاہیں گے آپکو لکھ دیں گے۔ روایت یہ رہی ہے کہ فوٹو گروپ کی ایک کاپی مجلس استقبالیہ کا کنوینر مرکزی دفتر کو ہدیتہً بھیجتا ہے جہاں وہ ریکارڈ میں محفوظ رہتی ہے۔ اسکے علاوہ جنرل سکریٹری اور صدر کے فوٹو بھی تحفتہً بھیجے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بیری تصویریں قیمتاً بھجوانا چاہتی ہیں تو لکھ دیجئے منی آرڈر سے بھیج دوں گا۔ وی۔ پی نہ بھجوایئے۔

دہلی کے ساتھیوں سے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنا کلام اور اپنے منظوم تاثرات آپ کو جلد بھیج دیں۔ شاید اس ماہ کے آخر تک آپکو یہ چیزیں مل جائیں گی۔ اپنے صاحب کو اور دوسرے عزیزوں کو سلام کہئے۔

گروپ فوٹو۔ صدر اور سکریٹری کے فوٹو تحفتہً میری طرف سے بھیج دئے گئے، آمنہ خاتون	نیاز مند قمر رئیس

۱۱ر دسمبر سنہ ۷۵ء

محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ۔ تسلیم

5 دسمبر کا نوازش نامہ ملا۔ شکرگذار ہوں۔ روداد کی پسندیدگی کے لئے ممنون ہوں۔ کانفرنس کی قراردادوں کی کاپی آپ نے ہماری زبان کے گزشتہ شمارہ میں دیکھ لی ہو گی 26 نومبر کو میری موٹر کا ایک خوفناک ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میں بھی زخمی ہوا اور کار کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کی وجہ سے انجمن کے بعض کاموں میں تاخیر ہو گئی۔ اب میں پھر سے کام میں لگ گیا ہوں۔ بڑودہ کے سید واجد اشرف کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر کامل قریشی کی ہفتہ عشرہ میں شادی ہونے والی ہے۔ حضرت کیفی بیمار ہیں۔ شاید اسلئے وہ کلام وغیرہ نہ بھیج سکے ہیں اپنا اور شہاب کا کلام دو چار روز میں بھیج دونگا [illegible] کب تک شائع کر رہی ہیں؟ وہ زیادہ ضروری ہے۔ گروپ فوٹو اور دوسری تصویروں کا انتظار ہے۔ اپنے صاحب کو اور دوسرے ساتھیوں کو آداب کہئے۔

والسلام
قمر رئیس

عتیق احمد صدیقی

۲ نومبر ۵ء
علی گڑھ

محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ

آپکے حسن اخلاق کے پہلے سے ہی قائل تھے، آپکے حسن انتظام کا بھی قائل ہوجانا پڑا۔ اتنی بڑی کانفرنس کے انتظام کا بار آپنے تن تنہا اپنے کاندھوں پر اٹھالیا۔ اور شروع سے آخر تک کوئی بدمزگی پیدا نہ ہونے دی۔ قیام، طعام، آرام، تفریح سب کا بہتر سے بہتر جو بندوبست ممکن ہوسکتا تھا آپ کی سعی احسن سے ہوگیا۔ سب مطمئن ہیں، سب خوش ہیں۔ واپسی میں ایک ایک شخص کی زبان پر آپکے لئے۔ محمد خان صاحب کے لئے۔ تعریفی کلمات تھے۔ بنگلور کی خوشگوار فضا، اکتوبر کا خوشگوار موسم اور اس پر مستزاد آپ کی پذیرائیاں، سبھی کو متاثر کرتی رہیں۔

"اوراق بصیرت افروز" میں اردو ایسوسی ایشن کی رپورٹ پڑھی تو آپ کی مساعی کا مزید احوال معلوم ہوا۔ اردو اور شعبہ اردو کو آگے بڑھانے میں آپ کی جانفشانیوں کا اندازہ ہوا۔ اردو کے طالب علموں کو سیاحت حیدرآباد کے لئے لے جانا، طالب علموں کو ادبی موضوعات پر مضمون نویسی کے لئے آمادہ کرنا اور ترغیب و تحریص کے ذریعہ ان سے اچھے مضامین لکھا لینا، ایک اچھے استاد کی لگن، دوراندیشی اور مضمون کے ساتھ والہانہ شیفتگی کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ نے یہ بھی بہت خوب کیا کہ نہ صرف مقامی اساتذہ کے بلکہ باہر کے اساتذہ کے لکچروں کا بھی انتظام کیا۔ اس سے یقیناً طلبا کو فائدہ ہوا ہوگا اور مختلف جامعات کے درمیان افہام و تفہیم اور تسلی رابطے کے لئے بھی اس سے راہیں استوار ہوئی ہوں گی۔ خدا کرے کہ آپ کی مساعی اسی جوش و ولولے کے ساتھ جاری رہیں اور حق ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری

میں اپنی طرف سے اور تمام اپنے ساتھیوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپنے اپنی یونیورسٹی میں مہمان رکھا اور مہمان نوازی کے تمام آداب پورے کر دیئے۔

خدا کرے کہ آپ بخیر ہوں۔ مسلسل اور تھکا دینے والے کام کا کوئی ناخوشگوار اثر آپ کی صحت پر نہ ہوا ہو۔ مولوی محمد خان صاحب کو سلام نیاز۔

مخلص: عتیق احمد صدیقی

ظہیر احمد صدیقی

۷ نومبر سنہ ۷۵ء
دہلی

محترمہ ڈاکٹر صاحبہ! اسلام مسنون

بنگلور کی کانفرنس سے جب احباب واپس آئے تو ان کی زبانی وہاں کی تفصیلات اور کانفرنس کی کامیابی کا علم ہوا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو اس کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے اپنی اس محرومی کا احساس ہے کہ ان محفلوں میں شرکت سے محروم رہا۔ نئے انتخابات کے سلسلہ میں بھی میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ خدا کرے کہ اساتذہ کی یہ انجمن اردو اور اس کے استادوں کی ترقی کے لئے فعال ثابت ہو۔ مخلص: ظہیر احمد صدیقی

شبیہ الحسن

۹ نومبر ۷۵ء
لکھنؤ

مکرمہ و محترمہ۔ تسلیم

کانفرنس کی خوشگوار یادیں لئے ہوئے میں لکھنؤ پہونچ گیا۔ آپ کو اور آپکے تمام رفقائے کار کو کانفرنس کے اہتمام و انصرام کے سلسلہ میں خوش اسلوب کارکردگی پر مبارکباد دیتا ہوں شخصی طور پر بھی آپ کا اس مہمان نوازی کے لئے ممنون ہوں جو آپ نے دوران قیام بنگلور میں مبذول رکھی۔ اُمید کہ مزاج گرامی ہر طرح سے بخیر ہوگا۔ پروفیسر محمد خان صاحب کی خدمت میں تسلیم۔

مخلص: شبیہ الحسن

تنویر علوی

۱۰ نومبر سنہ ۷۵ء
دہلی

قابل صد احترام آپا

ہدیۂ تسلیم و نیاز۔ ہم سب یہاں بعافیت پہنچ گئے مدراس سے ان تمام ساتھیوں کو ریزرویشن مل گیا تھا جنکو ہمارے ساتھ دہلی یا آگرے تک سفر کرنا تھا۔ لیکن واپسی کے اس سفر میں سب ساتھی ایک ساتھ نہ رہ سکے کوئی اس کمپارٹمنٹ میں رہا کوئی دوسرے کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی پھر بھی چونکہ گاڑی میں کوریڈر کے ذریعہ اس طرف سے اُس طرف آنا جانا ممکن تھا اس لئے سفر کے دوران برابر

ملاقات ہوتی رہی سب دوست خوش ہیں۔ اور بنگلور کے سفر پر طرح طرح سے اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے۔

آپا میں بطور خاص آپکا شکر گذار ہوں کہ آپ نے میرے حال پر توجہ فرمائی مجھے ہاں بلا یا اور اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود وقتاً فوقتاً مجھ سے باتیں کیں۔ اور دوسرے ساتھیوں کے سامنے مجھے بھائی کہکر میری عزت کو بڑھایا۔

میں آپکی تحقیقی کاوشوں اور علمی فضیلتوں سے واقف تھا لیکن اس کانفرنس کے موقع پر میں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ کس قدر ہمت اور حوصلہ کی خاتون ہیں اور ناسازگار حالات میں بھی اپنے ذہن کے توازن کو درہم برہم نہیں ہونے دیتیں۔ آپ کے خاندان کے افراد اور بالخصوص آپ کی بہن صغرا نے جس طرح اس کانفرنس کے دوران ان تھک طریقہ سے کام کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

آپکے ساتھ بھائی صاحب نے جس طرح کام کیا بخدا اس سے بھی پوری زندگی روشنی اور رہنمائی حاصل کرتا رہوں گا۔ آپ ان سے میرا آداب کہیئے۔ اپنے یم نئے کے طلبا اور طالبات سے بھی میری دعا کہئے اور ان خواتین سے بھی جو اساتذہ اردو میں سے ہی آپ کی ساتھی ہیں مگر ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ بیگم اور بچے آپکو آداب کہتے ہیں۔ کاش آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو اور جلدی ہو۔ سب کے لئے مناسبات بھائی صاحب کے لئے نذرانہ عقیدت نیاز اُستری وائس چانسلر صاحب سے بھی میرا آداب کہئے اور اپنے خاندان کے بچوں تک میری دعا پہنچایئے۔

تنویر علوی

۱۷ نومبر ۷۵

محترمہ آپا آمنہ خاتون صاحبہ

ہدیہ آداب و نیاز۔ کرم نامہ نے شرف صدور بہت سے نوازا۔ میں نے فارسی زبان میں ۳۰ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ جسے مختصر قصیدہ کہنا چاہئے، لکھ لیا ہے نظر ثانی کر رہا ہوں اس کی زمین قدرے مشکل ہے مگر چونکہ آپکے خوبصورت شہر، یونیورسٹی کی دل آویز فضا اور بالخصوص آپ کے وائس چانسلر سے بہت متاثر تھا اور ہوں۔ اس وجہ سے اس زمین میں بہت سے اچھے اور شگفتہ اشعار نکل آئے جسے آپ پڑھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ کی مخلصانہ فرمایش کو میں نے اس خوبصورتی سے پورا کر دیا اسے میں آپ ہی کی غائبانہ توجہ کا کرشمہ تصور کرتا ہوں۔

بھائی صاحب کے لئے نذرانہ نیاز، صغرا بی کے لئے مناسبات۔ اور بچوں کے لئے دعائیں۔

تنویر علوی

۱۲/دسمبر سنہ ۵۷ء

آپا

نذرانہ عقیدت و سلام۔ آپ کو میرے عریضہ کا انتظار ہوگا اور میں آپ کے خط کا منتظر تھا۔ نظم مکمل ہوگئی اس پر میری بعض مصروفیات کی وجہ سے نظر ثانی میں وقت لگا۔ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اسے یہاں سے بہت خوبصورت لکھوا کر بھیجا جائے لیکن وہاں پہنچے کیسے۔ راستے میں کاغذ اور تحریر دونوں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ ویسے آپا مجھے یقین ہے کہ آپ اس نظم کو دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی آپ نے جس طرح مجھ سے یہ فرمایش کی تھی میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے جواب میں اپنی معمولی سی صلاحیت کے مطابق ایسی ہی نظم لکھوں۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ بھیجنا چاہتا ہوں کہ اس کے بغیر ترجمے بھیا صاحب موصوف اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔

بارہ ماسہ کی روایت کی دوسری قسط میں نے بھی نوائے ادب میں اشاعت کے لئے بھیج دی۔ اب دوسرے کام کرنے کے لئے وقت نکال رہا ہوں۔ محترم بھائی صاحب کے لئے میری جانب سے نذرانہ ہائے عقیدت۔ نیازمند، تنویر علوی

محترمہ آپا آمنہ خاتون صاحبہ

دیکھئے آپ کی یہ بڑی زیادتی ہے کہ آپ نے مجھے دس روپے کا منی آرڈر کیا۔ اگر میں پہلے منی آرڈر پر بغیر دیکھے دستخط نہ کر دیتا اور پھر آپ کی خفگی کا خیال نہ آتا، تو میں اسی وقت اسے واپس کر دیتا اب نظم کے ساتھ انہیں آپ کی خدمت میں بھیج دوںگا۔

آپا کیا آپ اپنے اس بھائی کو اس لائق بھی نہیں سمجھتیں کہ وہ ایسے کسی موقع پر کوئی معمولی سا خرچ برداشت کرے۔ یہ نظم میری جانب سے آپ کی اور آپ کے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں ایک نذرانۂ عقیدت ہے اور مجھے اس کی خوشی ہے کہ میں آپ کی فرمایش کی تعمیل میں ایک اچھی سی نظم فارسی زبان میں بطور قصیدہ ترتیب دے سکا۔

میری تو یہ خواہش تھی کہ اس کا انگریزی ترجمہ یہیں ہو جائے لیکن سوچتا ہوں کہ آپ کی نگرانی میں یہ زیادہ بہتر ہو سکے گا اور کنڑا زبان میں آپ اس کا ترجمہ بلکہ بہت عمدہ ترجمہ خود فرما سکیں گی۔

میری جانب سے اس کی روانگی میں تاخیر میں ایک طرف تو میری مصروفیتیں شریک ہیں دوسری طرف یہ خیال کہ میں اس پر نظر ثانی کرسکوں ۔

اب میں کل اسے کاتب صاحب کے سپرد کردوں گا اور وہ خوبصورت تحریر آپکے پاس بھجوا دی جائیگی۔ اس کو فریم کرایا جانا اس لیے سودمند نہیں ہوگا کہ فریم راستے میں خراب ہوجائیگا ۔

کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اس نظم کو خود آپ کی خدمت میں ایک ادبی تحفہ کے طور پر پیش کرتا ۔ اس میں تین شعر آپ کی ذات گرامی کے بارے میں بھی ہیں کہ ان کے بغیر میرے نزدیک یہ نظم مکمل نہیں ہوسکتی تھی یہاں میرے جن دوستوں نے اس نظم کے اشعار سنے ہیں انھوں نے اسکو ایک بہت خوبصورت ادب پارہ قرار دیا ہے ۔

آپ فرمائش نہ کرتیں تو یہ نظم جو اس سفر کی ہی نہیں میری زندگی کی ایک بے حد خوشگوار یاد کا درجہ رکھتی ہے کہاں سے آتی ۔

آپا میں کہہ نہیں سکتا کہ میں خود کو آپ کا کس قدر احسان مند تصور کرتا ہوں ۔

باقی مناسبات ، تنویر علوی

ڈاکٹر مس ذکیہ انجم
صدر شعبۂ اردو

ماتا سندری کالج برائے خواتین
ماتا سندری لین ، نئی دہلی - ۱
مورخہ 17.11.75

محترم آپا صاحبہ ـــ تسلیم !!

حضرت خان صاحب کا عنایت نامہ موصول ہوا

حسب خواہش مشاعرہ میں پڑھی ہوئی غزل مع دوسرے اشعار ارسال کر رہی ہوں۔ بنگلور سے واپس آکر چاہتی تھی کہ اپنے اس تشکر کا اظہار تحریری طور پر کروں جو میں آپ سے نہ کرسکی۔ آپ نے جس اپنائیت، خلوص اور شفقت کا برتاؤ کیا وہ فی زمانہ مشکل سے نظر آتا ہے۔ گوہر اکثر یاد آتی ہیں ان تک دعا کے ساتھ میری یادیں پہنچادیں ۔

محترم قمر رئیس کی زبانی معلوم ہوا کہ گروپ فوٹو غیر معمولی طور پر بہت اچھا ہے۔ مجھے اس کی دو کاپیاں درکار ہیں، اس کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہوگی، مہربانی فرما کر ضرور تحریر فرمادیں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

نیازمند، انجم

جاوید وششٹ

شعبۂ اردو دلی کالج، اجمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۲۸ر نومبر ۱۹۷۵ء

محترمی جناب محمد خان صاحب

آداب و نیاز

چونکہ میں بنگلور سے واپسی میں اپنے چند احباب کے ساتھ حیدرآباد چلا گیا تھا اور ۹ نومبر کو دہلی پہنچا تو یہاں آکر بیمار ہو گیا اس لئے آپ کے گرامی نامہ کے جواب میں تاخیر ہو گئی۔ معذرت خواہ ہوں، مجھے بہت پہلے ہی ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا، بنگلور سے ہم لوگ حسین یادوں کا وافر ذخیرہ لے کر دلی پہنچے ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحبہ اور آپ نے جس محبت اور خلوص کے ساتھ ہم لوگوں کے ساتھ سلوک کیا وہ ہمیشہ دل پر نقش رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ دلی شکریہ کے لئے ناکافی رہیں صرف دل کی دھڑکنیں ہی کچھ اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔
حسب ارشاد وہ اشعار ارسال خدمت ہیں جو میں نے مشاعرہ میں پڑھے تھے، بیوڈیٹا کی ایک کاپی کانفرنس کے دفتر میں کسی صاحب کو دیدی تھی تاہم اس کی ایک اور کاپی ارسال کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ کی خدمت میں بہت بہت آداب، درون خانہ حسب مراتب سب کو سلام و دعا، امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ نیاز آگیں، جاوید وششٹ

ڈاکٹر ش۔ اختر
صدر شعبۂ اردو، دورندا کالج، رانچی یونیورسٹی۔

محترمہ۔ تسلیم
کانفرنس میں پڑھا گیا مقالہ ارسال خدمت ہے، امید ہے مجموعہ میں شامل کر دینگی، کانفرنس کی کامیابی کے لئے ایک بار پھر سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ خدا کرے آپ کی سرپرستی میں شعبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے، آمین، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہونگی۔

خیر طلب
ش، اختر

*
*

ناگپور 19.12.75

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خان ، منشا

صدر شعبۂ اردو ۔ ناگپور مہاودیالیہ ناگپور

محترمہ آپا جان

تسلیمات ۔ امید کہ آپ ہر طرح مع الخیر ہونگی، آپ کے حسب منشا دیگر اردو منظومات کا انگریزی ترجمہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اسمیں بھی نظم کا سا انداز رکھا گیا ہے ۔ امید کہ آپ پسند فرمائینگی، ان نظموں کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنے کی تجویز بہت خوب ہے ، یہ ایک یادگار چیز ہو جائے گی۔

منتظر جواب

خیرخواہ مخلص، محمد منشاء الرحمن خان منشا

ناگپور 11.11.75

محترمہ آپا

سلام مسنون ۔ امید کہ آپ ہر طرح مع الخیر ہوں گی ۔ کانفرنس کی تیاری سے لیکر اختتام تک آپ نے بے حد تکلیف اٹھائی ہے اور اچھی طرح مہمان نوازی فرما کر ہم سب لوگوں کو ممنونِ کرم کیا ہے ۔ اس اردو دوستی کے لئے اور خاطر و مدارت کے لئے تہ دل سے شکرگذار ہوں ۔

حسب وعدہ اس نظم کا انگریزی ترجمہ ارسال کر رہا ہوں جو عالی جناب نرسمہیا صاحب سے متاثر ہو کر سنائی تھی ۔ امید ہے کہ آپ اس انگریزی ترجمہ کو بھی خوب پسند فرمائینگی اس ترجمہ میں بھی نظم کا سا انداز قائم رکھا گیا ہے ۔

براہ کرم اس انگریزی ترجمہ کی دو تین کاپیاں ٹائپ کرالیجئے اور ایک میری جانب سے نرسمہیا صاحب کی خدمت میں پیش فرما دیجئے ۔ ویسے تو میں خود بھی اظہار تشکر کا خط انہیں لکھ رہا ہوں اور نظم کا ترجمہ بھی ارسال کر رہا ہوں ۔ آپ دونوں مخلص حضرات نے ہم لوگوں کو واقعی بے حد متاثر کیا ہے ، جی چاہتا ہے آپ سے اور دی. سی صاحب سے مزید ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے ۔

محمد منشاء الرحمن خان

ناگپور 17.10.75

محترمہ ڈاکٹر صاحبہ

سلام مسنون ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ آپ کا مراسلہ ملے کافی دن ہوگئے اپنی تدریسی و دیگر مصروفیات کی بنا پر جواب نہ دے سکا اس تاخیر کے لئے معافی کا خواستگار ہوں

بڑی مسرت کی بات ہے کہ انجمن اردو اساتذۂ جامعات ہند کی چھٹی سالانہ کانفرنس آپ نے بنگلور میں طلب فرمائی ہے۔ اور آپ از راہ اردو دوستی میزبانی کے فرائض انجام دینے والی ہیں۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ کامیابی کے لئے تہ دل سے دعاگو ہوں۔ برادرم ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا مکتوب کل ہی دستیاب ہوا۔ ان کا شدید اصرار رہا ہے کہ میں اس کانفرنس میں ضرور شریک رہوں۔ انہوں نے کنسیشن فارم بھی ارسال فرمایا ہے۔ اسلئے انشاء اللہ شرکت کی خاطر ۲۶ اکتوبر کو بنگلور حاضر ہو رہا ہوں اور "غیر اردو داں طلبا کو اردو پڑھانے کے مسائل" کے زیر عنوان ایک ۵ منٹ کا مختصر مقالہ تحریر کر کے لا رہا ہوں اس عنوان سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور غیر اردو داں حضرات میں تبلیغ اردو میرا محبوب مشغلہ ہے۔ امید ہے کہ میرے مقالہ میں آپ کو ضروری اور مفید معلومات مل جائینگی۔ براہ کرم مجھے کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کی اجازت عنایت فرمایئے گا۔ اور پروگرام میں اس مقالہ کے لئے ۵ منٹ کا مختصر وقت ضرور دیجئے گا۔

دیگر ایں کہ شائع شدہ ۸ کتابیں "کتب خانۂ آمنہ" کے لئے ساتھ لا رہا ہوں۔ ایک کتاب تو تحفتہً پیش خدمت کروں گا مگر باقی پانچ قیمتاً پیش کی جائینگی۔ انکی قیمت وہیں آنے پر عنایت فرما دیجئے گا۔

محمد مستان الرحمٰن خان

عابد صدیقی ۲۰ نومبر ۵ء

3.2.192 ۔ مغل پورہ، حیدرآباد

محترمہ ڈاکٹر صاحبہ، تسلیم

کل ہند اردو اساتذہ جامعات ہند کی کانفرنس کی یادیں ابھی تک ذہن کے گوشوں کو روشن کئے ہوئے ہیں آپکی انتھک کوششوں اور پُرخلوص محنت نے کانفرنس کو یادگار تاریخی بنا دیا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ انجمن کو ایک نئی زندگی بھی ملی۔ ان ساری کامیابیوں کے لئے بے پناہ مبارکباد قبول کیجئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے سارے اساتذہ اس کانفرنس کی کامیابی پر آپکو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور انھیں اس جشن دانشوراں میں شرکت نہ کرنے کا افسوس ہے۔

کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال میں نے اخبار سیاست میں بطور مضمون روانہ کیا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ اسکے علاوہ کانفرنس کی مکمل رویداد بھی یہاں کے اخبارات نے

نمایاں طور پر شائع کیا ہے ۔ آپکے حکم اور عزیز دوست جناب قدیر امتیاز کے تعاون سے میں اپنے اس فریضہ کو انجام دے سکا جسکی مجھے خوشی ہے ۔ اس بات کی بھی مسرت ہے کہ آپ سے ملاقات کرنے اور آپکی بے پناہ اردو نوازی کا قریب سے مطالعہ ومشاہدہ کرنے کا اتفاق ہوا بلاشبہ کرناٹک میں آپ بزم اردو کی رونق ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح یونیورسٹی میں آپنے اردو کو آباد کیلئے اسی طرح پوری ریاست میں آپ اردو زبان و ادب کی تشہیر کرینگی

وائس چانسلر اور آپ کے رفقاء بھی اس کامیابی کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ میری طرف سے سب کو مبارکباد پیش ہے ۔ اگر آپکو اخبارات کی کاپیاں درکار ہوں تو ضرور لکھیئے ، اردو کانفرنس میں عالیجناب محمد خان صاحب اور آپ کے ارکان خاندان نے جس جذبہ صداقت اور حوصلہ مندی سے حصہ لیا اس پر آپ کو اپنے سارے خاندان پر فخر کرنا چاہیئے ۔

خلوص و احترام کے ساتھ ، خیر طلب ، عابد صدیقی

محمود خاور — 6.11.75

ایڈیٹر ہفتہ وار "برگ آوارہ" حیدرآباد

محترم ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ
صدر شعبۂ اردو ۔ بنگلور یونیورسٹی

سلام و نیاز

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہونگی ' حیدرآباد واپسی کے بعد علیل ہوگیا اور اسی وجہ ناکہ خواہش کے باوجود فوری خط نہ لکھ سکا ۔ بہرحال اس کی تلافی کی کوشش کر رہا ہوں ساتھ ہی یہ خیال بھی دامنگیر تھا کہ آپ تھوڑے سے آرام کرلیں کیونکہ گزشتہ بیس پچیس یوم میں آپکو شب و روز معروف رہنا پڑا ! جسمانی تھکن کے علاوہ دماغی و روحانی تھکن بھی ہوئی ہے ۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی کوششیں ثمر آور رہیں اور اب بنگلور کی تاریخ میں ایسا عظیم علمی ' ادبی و تہذیبی اجتماع دیکھنے میں نہیں آئیگا ۔

میں ذاتی طور پر آپکے حسن انتظام کا قائل ہوگیا اور آپکی میزبانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں مقامی اخبارات کے چند تراشے اور برگ آوارہ کا ایک تراشہ منسلک ہذا ہے ۔ تفصیلی نیوز برگ آوارہ کے اگلے شمارے میں چھپے گی اور اسے آپ کی خدمت میں روانہ کردیا جائیگا ۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر شارب ردولوی کے خطوط آئے ہیں انہیں بھی اخبارات کے تراشے دور کا

کے قیام کے "تاثرات" بھی لکھ بھیجے تھے۔ آج ذرا سی فرصت ملی تو پھر آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اور ذہن کو بنگلور کے "پرخلوص تاثرات" نے گھیر لیا۔

دہلی آکر "اوراق بصیرت افروز" کا مطالعہ کیا، اس میں آپ کا مضمون "دُردانۂ اول": در بیان کیفیت زبان اردو و حروف تہجی اردو" بیحد اہم اور معلومات افزا ہے، اس میں اپنے بعض مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے، مبارکباد، دیگر مضامین جو آپ کے شعبے کے طلبہ اور طالبات نے لکھے ہوئے ہیں خاصے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مضامین طالب علمانہ کوششیں ہیں، اس لئے انھیں اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ یہ جرأت کی بات ہے کہ آپنے اپنے طلبہ و طالبات کے بیشتر مضامین یکجا کر دیے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اور آپکے طلبہ و طالبات زبان اور ادب کی خدمت کی کس درجہ لگن اور ذوق رکھتے ہیں۔

آپنے میرے مضمون "منظوم ترجمے کے عمل" کو پسند فرمایا تھا اور بنگلور کانفرنس کے بعد بھی اس کا تذکرہ فرمایا تھا وہ مضمون (تراشا) اس خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں، اپنی رائے سے مطلع فرمائیے،

مخلص، عنوان چشتی

مورخہ ۔ 21.11.75

مرزا محمد زمان آزردہ، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی
ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ایڈ ۔ حسن آباد۔ رَینا وری، سرینگر ۔ ۳

شفیق مکرم! تسلیم

آپ کا خط کئی دن پہلے ملا تھا، مگر بعض مصروفیات کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ بنگلور کے مشاعرے میں، میں نے صرف پانچ شعر پڑھے تھے۔ میرے خیال میں یہ آپ کی شفقت کا اثر ہے کہ اسوقت اس غزل کے دس اشعار یاد آگئے، دراصل اس دن میں بہت تھکا ہوا تھا۔ کشمیر سے چل کر بنگلور پہنچنے تک کہیں دم لینے کا بھی وقت نہیں ملا اور منزل پر پہنچ کر محترمہ آپا کا پروگرام ایک فوجی جنرل کا سا پروگرام تھا، ایک ایک منٹ کا انھوں نے حساب رکھا تھا۔

میری طرف سے محترمہ آمنہ آپا کی خدمت میں آداب عرض کیجئے، بنگلور کانفرنس کا انتظام جس سلیقے سے انھوں نے کیا تھا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ خدا حافظ،

خادم مرزا محمد زمان

شجاعت علی سندیلوی

۱۱۔ اشفاق اللہ مارگ
امین آباد۔ لکھنؤ ۔ ۱۵، اکتوبر سنہ ۷۵ء

محترمہ سلام مسنون

بڑی تمنا تھی کہ بنگلور کانفرنس میں شرکت کروں گا، اور آپ جیسی علم و ادب کی رسیا کی زیارت کروں گا، لیکن ہند و پاک کی جنگ کے تشفے نے چا۔ پانچ برس سے میری بیوی کے دماغ کو ماؤف کر دیا ہے، آج کل جوش و جنون زیادہ ہو گیا ہے، اس پریشانی کی وجہ سے ارادہ ترک کرنا پڑا، باہر جانا پھر ہفتہ عشرہ کے لئے بچوں پر ظلم کرنا ہے۔ نصف بہتر جب ہوش و حواس کھو بیٹھے تو کیا قیامت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتی ہیں۔ پروفیسر سید شبیہ الحسن، صدر شعبہ اردو ضرور تشریف لے جائیں گے، وہ میری نمائندگی کر دیں گے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ خدا کرے کہ کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہو، بہت بہت معذرت کے ساتھ،

مخلص: شجاعت علی سندیلوی

پروفیسر حسرت سہروردی، ترچناپلی،

مورخہ 24.10.75

محترمہ، تسلیم

میرا مقالہ جو کہ بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ مل گیا ہوگا۔ چوں کہ اپنی اہلیہ کے ساتھ آ رہا ہوں، ہاسٹل کے متعلق تشویش ہے۔ سنا ہے کہ یونیورسٹی شہر سے بہت دور ہے اور سواری کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ اگر ہاسٹل میں انتظام نہیں ہو سکتا تو یونیورسٹی کے قریب میں جو بھی بہتر ہوٹل مل جائے رہ جاؤں گا۔ خیر طلب، حسرت سہروردی

ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی

مورخہ 12.7.75

محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ، تسلیم

کل گیارہ جولائی کو ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے گھر دہلی میں موجودہ انجمن اساتذۂ اردو

کے عہدہ داروں کا ایک جلسہ ہوا، جس میں اتفاق رائے سے مجوزہ بنگلور کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کا پروگرام طے ہوا۔ اور اس کانفرنس کے سلسلے میں آپ کی مساعی کو سراہا گیا۔ پروگرام کی تفصیل الگ لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ آپ کو اس سے اتفاق ہوگا۔ اگر اس میں آپ کسی تبدیلی کے خواہاں ہوں تو براہ کرم فوراً مطلع کیجئے۔ یہ پروگرام کم و بیش وہی ہے جو مظفر پور کانفرنس کے لئے طے ہوا تھا۔

آپ نے لکھا ہے کہ کانفرنس کا افتتاح ریاست کے گورنر جناب کھاڈیا صاحب سے کرانے کا ارادہ ہے۔ اگر آپ لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، مجلس استقبالیہ کی تشکیل جلد سے جلد کر لیجئے اور اس کا صدر یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کو بنائیے، یہی روایت رہی ہے۔ *

مجھے بنگلور سے دو ایک اساتذہ کے خطوط ملے ہیں۔ جن میں انہوں نے مجوزہ کانفرنس میں اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے، لیکن اس پر زور دیا ہے کہ اگر کانفرنس نئے کیمپس میں ہوئی تو ناکام رہے گی۔ اور مندوبین کو تکلیف اور پریشانی ہوگی۔ اس لئے ان کی رائے ہے کہ کانفرنس سنٹرل کالج میں ہو۔ بہر حال یہ سب طے کرنا آپ کا کام ہے، مقامی اساتذہ اور وائس چانسلر صاحب سے مشورہ کے بعد آپ جو مناسب جگہ سمجھیں وہاں رکھیں۔ مقصد یہی ہے کہ کانفرنس کامیاب ہو اور مندوبین کو تکلیف نہ ہو۔ ان معاملات میں آپ کو پوری آزادی حاصل ہے۔ فقط۔

* دیکھیں نوٹ ص۱۸

مورخہ 9.10.75

محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ، تسلیم

آپ کا ایک خط آج ملا۔ سرور صاحب کے نہ آنے کا افسوس رہا۔ ڈاکٹر علیم صاحب شاید آجائیں انسے ہم لوگوں نے بھی درخواست کی ہے۔ ترقی اردو بورڈ دہلی کانفرنس میں اپنی مطبوعات کی نمائش کے لئے تیار ہو گئے ہیں، آپنے دعوت نامے ضرور سب کو بھیجے ہوں گے، کچھ ڈاک میں غائب ہو گئے، کچھ کے پتے غلط ہوں گے۔ آپنے جو دعوت نامے مجھے بھیجے تھے وہ میں بھیجتا رہا ہوں، اب تین دن سے ریلوے کنسشن فارم پوسٹ کر رہا ہوں، یہ سارا کام میں تنہا کر رہا ہوں، شارب صاحب لکھنؤ چلے گئے ہیں۔ یوں بھی ان کا تقرر

ترقی اردو بورڈ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہو گیا ہے، ہفتہ عشرہ میں وہ [illegible] جوائن کریں گے۔ گزشتہ سال کچھ اساتذہ [illegible] آئے تھے، وہ شارب صاحب کے پاس ہے۔ ان سے لے کر بھیج رہا ہوں، وقت کم ہے۔ اگر آپ شائع کر دیں تو بہت اچھا ہو۔

مضامین مجھے بھی نہیں مل رہے ہیں، دراصل یہی ہوتا ہے، اساتذہ لکھتے ہی مضامین لاتے ہیں۔ اس سے بڑی بدمزگی ہوتی ہے، بحث بھی نہیں ہو پاتی۔ مگر کیا کیا جائے اردو والے سلیقے سے کوئی کام کرنا نہیں جانتے۔ چار ریلوے کنسیشن فارم آپ کو بھی بھیج رہا ہوں، اگر وہاں سے کوئی طلب کرے تو نام وغیرہ لکھ کر بھیج دیجئے گا۔ ہم لوگ کوشش کریں گے کہ 5 تاریخ کی صبح تک سب لکھنؤ پہنچ جائیں۔ نیازمند: قمر رئیس

ولہ

مورخہ 19.9.75

دہلی۔ محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ

یو پی، بہار اور دہلی سے ابھی تک جن اساتذہ نے کانفرنس میں شرکت کے بارے میں لکھا ہے اور سالانہ چندہ بھیجا ہے ان کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے۔ گمان ہے کہ شمالی ہند سے اس سے زیادہ اساتذہ شریک نہیں ہوں گے۔

اساتذہ کا بایوڈیٹا شائع کرنے اور ان کی کتابوں کی نمائش کرنے کی تجویز بہت مناسب اور معقول ہے۔ نمائش کی تجویز بہت اچھی ہے اور یہ ایک نئی بات ہوگی۔

متوقع شعراء کی نامکمل فہرست پیش کر رہا ہوں: 1. ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ 2. جاوید وششٹ 3. ڈاکٹر عنوان چشتی 4. ڈاکٹر شارب ردولوی 5. شہاب جعفری 6. وسیم بریلوی 7. عابد پشاوری 8. عتیق اللہ۔ باقی شعراء سے خط و کتابت کر کے آپ کو اکتوبر کے اوائل میں لکھوں گا۔ ہم نے سب [illegible] ان میں سے جن شعراء کو یونیورسٹی یا کالج کی طرف سے زادراہ وغیرہ ملے گا ان کو کسی طرح کا معاوضہ نہیں دیا جائے گا، مثلاً میرے اور ڈاکٹر محمد حسن کو ملا کر دس اساتذہ ایسے ہوں گے جن کو اگر آپ سو روپیہ معاوضہ دے دیں تو بہت اچھا ہو۔ نیازمند: قمر رئیس

ولہ

مورخہ 11.9.75 دہلی۔ محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ تسلیم

آپ کا 3 ستمبر کا مکتوب ملا۔ یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ سفر کے دوران آپ کے دو سوٹ کیس چوری ہو گئے، غالباً انہیں میں ہی تھیں، پتہ نہیں آپ کا بہت نقصان [illegible] ہو گیا تھا یا نہیں؟

اگر آپ مشاعرہ ہی کے بارے میں بندوبست کرنا نہیں چاہتی ہیں تو مناسب ہے۔ صرف

اساتذہ شعراء ہی حصہ لیں۔ پتہ نہیں آپ نے مشاعرہ کی صدارت کے لئے سرور صاحب کو خط لکھا یا نہیں؟

عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ لوگ اپنے مقالات پہلے سے نہیں بھیجتے فیس وغیرہ بھی نہیں بھیجتے۔ وہیں آ کر دیتے ہیں اسلئے انکے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔

نیاز مند، قمر رئیس

ضروری بات: آپ نے جو لکھا ہے کہ اس بار کانفرنس میں جو انتخاب ہو اس میں موضوع ٹیم کو بھی مزید توسیع دی جائے۔ ہم لوگ آپ کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہیں، لیکن اس سلسلہ میں اپنے ہم خیال مقامی اساتذہ سے بات ضرور کر لیجئے گا۔

ولہ

مورخہ 24 4.75 محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ، تسلیم

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۵ء کے وسط میں کانفرنس کے انعقاد پر خوشی اور رضامندی کا اظہار کیا، انجمن کے تازہ خبرنامہ میں بنگلور کانفرنس کا اعلان دیا گیا ہے، اس خاص حصہ کا بیان آپکو بھیج رہا ہوں۔ اساتذہ کی مکمل فہرست آپکو مئی کے پہلے ہفتہ میں مل جائے گی۔ نیاز مند، قمر رئیس

نوٹ متعلق ص ۱۶

افسوس ہے کہ مذکورہ اساتذہ نے نئے کیمپس میں کانفرنس کی کامیابی کا غلط اندازہ لگایا پھر اپنے خدشے مجھ پر ظاہر کرنے کی بجائے دہلی کو خط لکھے اور ڈاکٹر قمر رئیس کو تشویشناک کیا، اور ان سے دس بارہ جملے لکھوا لئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو مذکورہ اساتذہ کے خدشوں سے مطلع کیا۔ میں نے ۱۹ جولائی کو میٹنگ بلائی۔ تحریری طور پر اساتذہ کو کانفرنس گاہ سے مطلع کیا اور ان کے دستخط لیے۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

آمنہ خاتون۔

شملہ یکم اکتوبر [illegible]

مائی ڈیر تسنیمہ خاتون

آپ کا خط [illegible] ملا جس سے معلوم ہوا کہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ اکتوبر کو آپ کے [illegible] انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی کل ہند کانفرنس بنگلور میں ہو رہی ہے، اس سے پہلے تاریخوں کی کوئی اطلاع [illegible] تھی، آپ نے ازراہ عنایت مجھے اس موقع پر [illegible] صدارت کے لئے یاد کیا ہے، شکریہ۔ میری مجبوری یہ ہے کہ یہاں [illegible] میں ۲۰ اکتوبر سے ۲۶ اکتوبر تک "[illegible] انسان کا تصور" موضوع پر ایک سیمینار ہو رہا ہے جس کی نگرانی میرے سپرد ہے، چنانچہ [illegible] اس کے سلسلہ کی مصروفیت رہے گی، اگرچہ ہوائی جہاز سے بھی دہلی سے چلوں [illegible] ۲۷ کو [illegible] پہنچ سکتا ہوں اور وہاں سے ۲۸ کی [illegible] تک بنگلور [illegible] کانفرنس کے اختتام پر پہنچنے کی کوئی صورت [illegible] ہوائی جہاز [illegible] ان حالات کے پیش نظر میری معذرت قبول فرمائیے۔

امید ہے کہ آپ کی توجہ اور کوششوں کی وجہ سے بنگلور میں جو کانفرنس ہو رہی ہے وہ ہر طرح کامیاب ہوگی اور اردو کے اساتذہ اپنے مقاصد [illegible] سبھی کام [illegible] کانفرنس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ خان صاحب کو میرا سلام کہیے۔ [illegible]

مخلص آل احمد سرور

ڈاکٹر جعفر رضا، الہ آباد یونیورسٹی۔

مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

محترمہ، تسلیم

لکھنؤ کی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی اور آپ کی [illegible] شخصیت کا نقش قائم ہے، آپ کے خط نے ہمیں [illegible] کیا کہ ایک بار پھر ملاقات کی کوشش کرنا چاہئے، ارادہ کر رہا ہوں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں، الہ آباد سے کئی اساتذہ کی شرکت متوقع ہے۔

نیازمند: جعفر رضا۔

ظہیرصدیقی،

مورخہ 23.9.1975

محترمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ! اسلام مسنون

اگرچہ آپ کا عنایت نامہ آئے ہوئے کافی دن ہوگئے مگر ذاتی کروہات میں اس طرح مبتلا رہا کہ پہلے خط نہ لکھ سکا۔ آپ نے جس خلوص اور محبت سے والدہ صاحبہ کی وفات پر دلجوئی فرمائی ہے اس کا دل پر بے حد اثر ہے۔ ایسے موقع پر احباب کی تسلی بڑا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ سے مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کا خواستگار ہوں۔

آپ کے خط قمر رئیس صاحب کے نام آتے رہے ہیں اس سے آپ کے اکناف کا علم ہوتا رہا ہے۔ ان سے ہی معلوم ہوا کہ آپ کا سفر میں سامان چوری ہوگیا۔ اور کافی نقصان ہوگیا۔ اس کا بے حد افسوس ہے۔ اس زمانہ میں معمولی سامان کی بہت قیمت ہوتی ہے نہ کہ اس قدر سامان کا چلا جانا یقیناً بڑا سانحہ ہے۔

میری بے حد خواہش تھی کہ اس کانفرنس میں شرکت کروں۔ اس مرتبہ قمر رئیس صاحب کا نام یونیورسٹی کی طرف سے ہے جن کو یونیورسٹی خرچ دے گی۔ خیال تھا کہ میں اور بیوی اس کانفرنس میں شرکت کریں مگر اس قدر طویل سفر اور خرچہ کے خیال سے میں تنہا آؤں۔ وہ بھی کچھ مشتبہ ہے۔ بہرحال ابھی تو کافی وقت ہے۔ ویسے ابھی تو آنے کا ہی ارادہ ہے۔

آپ کا خیال درست ہے کہ اگر اس موجودہ ٹیم کو آئندہ سال کے لئے موقع ملے تو شاید کچھ اور کام کرسکے۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ بعض احباب ابھی سے اس کوشش میں ہیں کہ موجودہ ٹیم کو نظر بند کر دیا جائے۔ اس بارے میں تفصیل ملاقات کے وقت بتاؤں گا۔

آپ کا مخلص، ظہیر صدیقی

ڈاکٹر غلام عمر خان

ایم اے (بی۔ای ڈی۔پی ایچ۔ڈی)، ریڈر، ڈپارٹمنٹ آف اردو

عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد۔

۱۰ مارچ ۷۶ء

ڈاکٹر صاحبہ گرامی۔ السلام علیکم

کل دوپہر کو حیدرآباد لوٹا۔ بنگلور میں جس خلوص و کرم کا اظہار آپ نے اس خاکسار کے تعلق سے فرمایا اُس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ شعبۂ اردو کے دوسرے احباب کی عنایت اور گرم جوشی بھی، ہمارے تہذیبی رشتوں میں استواری کا احساس بڑھا دیتی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ آپ کی فعال اور پرسوز شخصیت کا اثر ہے۔ بنگلور میں شعبۂ اردو کے قیام کے تعلق سے، آپ نے جو طویل جد و جہد کی ہے، اس کا کچھ حال سنا تھا۔ لیکن جو کچھ دو ایک . . دن میں دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ گذشتہ آٹھ سال کی قابل لحاظ مدت کے دوران، اگر بنگلور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو، آپ جیسی حوصلہ مند، ذہین اور باصلاحیت خاتون کی خدمات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا، تو شاید بنگلور میں اردو کی نشو و نما کے لیے اور مراحل طے ہو جاتے جس دل سوزی اور جگر کاوی کے ساتھ، آپ نا موافق حالات کے باوجود، بنگلور میں اردو کی عمارت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اسے دیکھ کر اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے!
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

خدا کرے آپ کی راہ سے رکاوٹیں دور ہوں۔ اور آپ اور آپ کے رفقا کی کوششوں کی بدولت، بنگلور اور میسور، کرناٹک میں اردو کے دو اہم مرکز کی حیثیت سے ابھریں۔

اپنی تعلیمی اور تدریسی زندگی میں، قدرت نے آپ کو ایک اور نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ اور وہ جناب نعیم خاں صاحب کی شخصیت ہے۔ ان کی گفتگو اور شخصیت میں جو عالمانہ رچاؤ، دلکشی، سادگی اور وزن ہے، وہ ایک متاع کمیاب ہے۔ ان کی شخصیت یقیناً، آپ کے لیے روشنی اور حرارت کا ماخذ رہی ہوگی۔ ویسے آئے دن جامعات کی تعداد کے ساتھ ساتھ، نام نہاد پروفیسروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن وقف شدہ علمی ہستیاں کمیاب ہوتی جا رہی ہیں۔ پروفیسر کا لفظ تو اپنی حرمت کھو چکا ہے۔

آپ کی عنایات کے لیے صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ سیر و سفر کا خواہش مند ہوں اور نہ ممتحنی کے معاوضے، پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔ خدا نے جو کچھ دے رکھا ہے، اس سے ضرورتیں، بھلے برے طریقے پر پوری ہو جاتی ہیں۔ لطف و کرم کا بندۂ بے دام ہوں، اور جہاں، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی روشنی، اور ان کا پاس و لحاظ ملے، تو سر نیاز خم ہو جاتا ہے۔

میری طرف سے قدیر امتیاز صاحب، فہمیدہ بیگم صاحبہ اور وحید النسا بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ میری بیوی زبیدہ، اور لڑکا نواز، دونوں آپ اور جناب خاں صاحب کی خدمت میں تسلیم عرض کرتے ہیں۔

آپ کی اور جناب خاں صاحب کی صحت و شادمانی کا متمنی ہوں۔

مخلص، غلام عمر خاں

بی۔ اے آنرس اور ایم۔ اے کے نصاب کے مسائل

اعلیٰ تعلیم کے نصاب کا مسئلہ اتنا دشوار اور پیچیدہ نہیں ہے جتنا اسے بنا دیا گیا ہے۔ اگر ہم خود غرضی اور بعض ذاتی عصبیت سے آزاد ہو جائیں تو ایک بہتر اور صحت مند نصاب تیار کر سکتے ہیں کیونکہ صورت حال تشویشناک حد تک بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ آج ادب کا طالب علم نہ زبان و ادب کی تاریخ سے واقف ہوتا ہے اور نہ اسے کسی طرح کی ادبی سوجھ بوجھ حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی حال پہلے اس وقت کھلتا ہے جب وہ لکچرر کی حیثیت سے شعبہ میں داخل ہو کر دیوان غالب سے اشعار کے کلام کو غالب کا سمجھ بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے یہ حالت تمام یونیورسٹیوں میں نہ ہو لیکن ہر ایک دانش گاہ اس طرح کے تشویشناک مسئلوں سے دوچار ہے۔

سماجی علوم کے نصاب کا مسئلہ نسبتاً آسان ہے۔ وہاں اسکی فکر نہیں ہوتی کہ امیدوار جس زبان میں اپنے جواب کا اظہار کر رہا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ انکے لیے اسکی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ خلیل کو تحلیل کیوں لکھ رہا ہے۔ مگر ہمارے لئے یہی بنیادی مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس لیے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ فرسٹ ایر سے ایم۔ اے تک کے نصاب میں ایک ایسا تسلسل قائم کیا جائے جو چھ سال کی مدت میں طالب علموں کو زبان و ادب کی تمام بنیادی خصوصیتوں سے واقف کرانے میں مدد دے اور جب لڑکا ایم۔ اے پاس کرلے تو اسے کم از کم یہ مقدور حاصل ہو کہ وہ یہ کہہ سکے کہ زبان و ادب کا بھی اک رشتہ ہے۔ لیکن نصاب بناتے وقت اشخاص کے مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تعلیم کے مقاصد کو نہیں۔ اس سے طالب علموں کی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی۔ میں مختلف یونیورسٹی کے آنرس اور ایم۔ اے کے نصاب کی طرف آپکی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔

۱۔ ہمارے ہاں آنرس میں اقبال کی چھ نظمیں، پانچ غزلیں گذشتہ بیس برسوں سے پڑھائی جا رہی ہیں۔ اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوئی۔

۲۔ حالی اور شبلی کے مقالات کے دو انتہائی غیر اہم مجموعے نثری حصہ کی خانہ پری کرتے ہیں کیونکہ مرتبین نصاب اسے پڑھنا اور پڑھانا عمل خیر تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کی اہم تصنیفات بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔

۳۔ آنرس کے ایک پرچہ میں حضرت محمدؐ اور خلفائے راشدین کی تاریخ جو تقریباً بیس برسوں سے پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کی پشت پناہی یہ منطق کرتی ہے کہ اردو

ادب کے طالب علموں کو تاریخ اسلام سے واقفیت ہونا چاہئے۔ انکی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ دینی تعلیم کی جگہ یونیورسٹی کا اردو شعبہ نہیں ہے۔ میرے کئی غیر مسلم طالب علموں نے اس پہلو کی طرف اشارے کئے ہیں۔ انکا یہ کہنا درست ہے کہ جس ملک کی اساس غیر مذہبیت پر ہے اور جہاں کا تعلیمی نظام کم از کم اصولی طور پر غیر مذہبی ہے وہاں ٹکسٹ بک کو بھی سیکولر ہونا چاہئے۔ میں اسلامی ادب کو نصاب سے خارج کرنے کا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کا زمانہ اور انکے عہد میں ہونیوالی جنگوں سے اردو ادب کا براہ راست کوئی رشتہ نہیں۔ ہم اسلامی تہذیب و تمدن کے نقوش اجاگر کر سکتے ہیں اور ان موضوعات پر ادبی تخلیقات کو نصاب کے دائرہ میں بھی لایا جا سکتا ہے لیکن تاریخ اسلام کی ضخیم جلدیں اردو آنرس کے نصاب کا جز نہیں بن سکتیں ہم اردو ادب کے طالب علموں کو تاریخ اسلام پڑھا کر مشرف بہ اسلام نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا نظریاتی تعصب کی بدترین مثال ہوگی۔

ڈرامہ کو نصاب میں رکھا گیا ہے لیکن گھوم پھر کر [illegible] سے آگے ہماری نظر نہیں جاتی۔ اگر بہت کوشش کی تو ہماری آنکھوں پر پردۂ غفلت پڑ گیا۔ یا ایک نقش آخر کو دیکھ کر مستقیم سمجھ کر ایمان تازہ کر لیتے ہیں۔ ہماری معلومات اور کتب بینی کا دائرہ یہیں تک محدود ہے۔

ایم۔ اے میں ایک عروض کا پرچہ پچاس نمبر کا کر دیا گیا۔ اس لئے مجھے ناپ تول کے علاوہ کچھ نہیں آتا اور اس کے ذریعہ ہم آسانی سے طالب علموں کو اپنی گرفت میں رکھ سکتے ہیں۔ ادب کا علم دوں ہو تو مطالعہ کی کم مائیگی کو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب دونوں کا فقدان ہو تو یہ مطالبہ بے سود ہو جاتا ہے کہ نصاب میں اعلیٰ اور معیاری ادب کو شامل کیا جائے جہاں اساتذہ کی پریشانیاں نہیں ہیں اور صاحب ... نظر کی بھی کمی نہیں وہاں نصاب کے مسائل اس ربط نہانی سے پیچیدہ ہو جاتے ہیں جسے جانتے سبھی ہیں لیکن اظہار کرنا مصلحت کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ اگر ہمیں عظیم آباد سے دلی، رانچی سے گورکھپور گیا سے علی گڑھ کا سفر پسند ہے اور ان شہروں میں رہنے والے دانشوروں کو بھی چھوٹی چھوٹی جگہوں کی سیاحت سے دلچسپی ہو جاتی ہے تو سارا کلاسکی ادب ایک طرف رکھا جاتا ہے اور انکی جگہیں وہ کتابیں لے لیتی ہیں جنکے نام لفافے میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ مثالیں ہماری خود غرضی، مفاد پرستی اور ذہنی تعصبات کا اظہار کرتی ہیں۔ ان تلخ حقائق کے ذکر سے مجھے کسی فرد واحد کی دل شکنی ہرگز مقصود نہیں۔ بلکہ ان کمزوریوں کی تلافی چاہتا ہوں جن کی وجہ سے ہمارے طالب علم [illegible] دونوں میں اچھے ادب کے مطالعہ سے محروم رہتے ہیں۔ ان معاملات کے [illegible] کانفرنس میں چند تجاویز رکھنے کی جرأت

کرر ہا ہوں جنھیں اگر عملی شکل دی گئی تو استاذ اور شاگرد دونوں میں پڑھنے اور پڑھانے کا شعور بیدار ہو سکتا ہے۔ اچھا نصاب اچھے ذہن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس امر پر یقین رکھتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جو زبان و ادب کے قیمتی سرمایہ کو طالب علموں تک پہنچا سکے اور جسے ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیاں اپنا سکیں۔ یہ کام ایک ایسی کمیٹی کر سکتی ہے جس کی تشکیل اسی کانفرنس میں کردی جائے۔ وہ اپنی سفارشات تمام یونیورسٹیوں کو بھیج دے تاکہ وہاں کا شعبۂ اردو ان سے فیض حاصل کرسکے۔ اس طرح بی۔ اے اور آنرز کی سطح تک اچھے، صحت مند اور معلوماتی نصاب کی ترتیب عمل میں آجائیگی

ہماری کوشش ہو کہ ہم کلاسیکی ادیبوں اور شاعروں کی تصنیفات کو اپنی تحقیقات پر فوقیت دیں تاکہ مطالعہ کا سلسلہ جاری رہ سکے اور کاروباری مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جانیوالی کتابیں ذہین ادب عالیہ کے مطالعہ سے محروم نہ رکھیں۔

ایم۔ اے میں ایک ایسا پرچہ ضرور ہونا چاہئے جو عصری زبان و ادب سے آشنا کرائے۔ اسکے بھی کئی حصے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مغربی ادب کے تحت انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمنی ادب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے۔ قومی زبان و ادب کے دائرہ میں ہندی، بنگلہ، پنجابی اور جنوبی ہندوستان کا ادب بھی شامل ہو تو

فارسی اور عربی ادب کا ایک خصوصی پرچہ ہو جس میں ترجمہ کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو۔ اقتباسات کا محض ترجمہ کر کے نہ لڑکا فارسی سیکھتا ہے اور نہ استاد کی فارسی (اصلاحیت میں) اضافہ ہوتا ہے کیونکہ دونوں کی گاڑی نوٹس کے سہارے آگے بڑھتی رہتی ہے۔

ایم۔ اے میں لوک ساہتیہ یا عوامی ادب کا بھی ایک پرچہ ہونا چاہئے جس کے معلومات سے اردو ادب کے اکثر طالب علم محروم ہیں۔

جدید ادب کو نصاب کی سرحد سے باہر کی چیز نہ تصور کریں۔ اسکے ایک معیاری انتخاب کو نصاب کا حصہ بنانا چاہئے تاکہ ہم موجودہ ادبی و تہذیبی رجحانات سے غافل نہ رہ سکیں۔

(کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پڑھا گیا)

اردو کا پہلا ڈراما

ڈاکٹر اخلاق اثر

گومتی کے کنارے انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی چوتھی کانفرنس کے شعبہ تحقیق کے خطبہ صدارت میں ڈاکٹر گیان چند نے نظریاتی تحقیق کے ساتھ ساتھ علمی تحقیق کی اہمیت بھی واضح کی تھی اور مختلف اصناف اور فنون کے پہلے نمونوں کی تلاش اور فیصلہ پر زور دیا تھا۔ انجمن کے شعبہ تحقیق کے اجلاس میں اردو کے پہلے ڈراما کے بارے میں اظہار خیال کا موقع عنایت کیا گیا۔

اردو کے پہلے ڈرامے کے بارے میں اظہار خیال سے قبل ڈراما کے فنی تصور اور تکنیک سے متعلق یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ فنون لطیفہ میں ڈراما اسٹیج کا پابند ہے اور اداکاری کا محتاج ہے۔ ڈرامے کا فن ایک تخلیقی فن ہے اور اس کی اپنی ہیئت ہے۔ ڈراما ایک صنف ادب ہے ... مختلف فنون اور فنکاروں کے اشتراک اور امتزاج سے ڈراما اسٹیج پر پیش ہوتا ہے اور تماشائیوں کی موجودگی میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ڈراما کے مختلف نام ہیں، جیسے سنسکرت اور ہندی وغیرہ میں ناٹک، اردو اور انگریزی وغیرہ میں ڈراما۔ جرمنی میں ڈریمٹ اور فرانسیسی میں "درام" کہتے ہیں۔ ڈراما کی تعریف متعدد اور ارسطو کے عہد سے لے کر ہمارے عہد تک بہت سی تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ میں صرف اس تعریف کی طرف توجہ چاہتا ہوں جس کی بنیاد پر ڈراما ادب و فن کی دوسری اصناف اور اقسام سے مختلف اور منفرد ہے۔

جدید تحقیق کی روشنی میں خواجہ احمد فاروقی کا تلاش کردہ ڈراما اردو کا قدیم ترین معلوم ڈراما ہے۔ یہ ڈراما سائمن ڈگبی صاحب کی ملکیت میں ہے اور سائمن ڈگبی صاحب لندن میں آکسفورڈ سے وابستہ ہیں۔ اس ڈرامے کے مخطوطے پر نہ تو سن کتابت درج ہے نہ سن تصنیف۔ اس ڈرامے کی قدامت کا اندازہ اس مہر سے ہوتا ہے جو اس مخطوطے پر ثبت ہے۔ رچرڈ اسٹریچی ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۸ء تک لکھنؤ کا رزیڈنٹ رہ چکے ہیں، ان کی مہر اس مخطوطہ پر لگی ہوئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ڈراما ۱۸۱۶ء یا اس سے قبل تحریر کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں ڈراما کے اصولوں کی پابندی کی گئی ہے۔ نیز یہ داستانوں اور مثنویوں کا اثر ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے تحریر فرمایا ہے

کہ "اس ڈراما میں تیس ورق ہیں۔ سائز بڑا ہے اور خوش خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے"
انہوں نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ جہاں تک میرا علم ہے اردو کا کوئی ڈراما ان تاریخوں
سے پہلے کا نہیں ملتا۔ اگر یہ اولین ڈراما نہیں تو اردو کے قدیم ترین ڈراموں میں ضرور
شامل ہے۔" میرے مقالے "اردو کا پہلا ڈراما" مطبوعہ ہماری زبان دہلی کے سلسلے میں،
ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ اگر یہ ڈراما جس کی نشاندہی خواجہ صاحب
نے کی ہے مل بھی جائے تو یہ اردو کا پہلا دستیاب ڈراما ہوگا، اردو تھیٹر کا نہیں۔"
ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر حکم چند نیر کی موجودگی میں خواجہ صاحب نے فرمایا تھا کہ اس
ڈرامے کا اب ایک ورق دستیاب نہیں ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اس ڈرامے کو ہم اردو کا پہلا
معلوم مگر نامکمل ڈراما کہہ سکتے ہیں۔ البتہ اس تعلق سے اردو ڈرامائی تاریخ ۱۸۱۶ء یا اس سے قبل
سے شروع ہونے کا تقاضہ کرتی ہے۔

اردو کا پہلا دستیاب ڈراما: پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی روشنی
میں واجد علی شاہ کا تحریر کردہ رادھا اور کنہیا کا قصہ ہے۔ یہ ڈراما ۱۸۴۳ء میں اسٹیج کیا
گیا تھا۔ واجد علی شاہ اردو تھیٹر کے بانی بھی تھے اور احتشام حسین اور مسیح الزماں نے انہیں
"ہندوستانی اسٹیج" "کھڑی بولی کا تھیٹر" کا بانی کہا ہے۔ مسیح الزماں نے واجد علی شاہ کے
ان رہسوں کو محدود طبقہ تک محدود کہا ہے مگر اس بیان سے ڈرامے کی تاریخ پر کوئی اثر
نہیں پڑتا۔ چونکہ ایک اور ڈراما معلوم ہو چکا ہے اس لئے اس ڈراما کو ہم اردو کا دوسرا
ڈراما کہیں گے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے [illegible] اردو کا پہلا ڈراما لکھا جو
۲۰ نومبر ۱۸۵۳ء کو گرانٹ روڈ تھیٹر بمبئی میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ انہوں نے ۱۸۷۱ء میں اسٹیج کئے گئے
ڈراموں کا بھی ذکر کیا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے [illegible]
کے دیباچے سے متاثر ہو کر خورشید کو اردو تھیٹر کا پہلا ڈراما [illegible] ۱۸۷۱ء [illegible]
گیا تھا۔ اس سے قبل وہ [illegible] کو کھڑی بولی کا پہلا تھیٹر بھی کہہ چکے تھے۔ اندر سبھا کو پہلا
ڈراما کہہ چکے تھے۔ پھر [illegible] فرمائی کہ [illegible] مراد [illegible] پارسی تھیٹر سے ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں
اندر سبھا کے دیباچہ میں لکھ چکے تھے کہ ۱۸۶۰ء میں اندر سبھا پہلی بار گرانٹ روڈ بمبئی تھیٹر ہال میں
پیش کی گئی تھی۔ اس لئے [illegible] خورشید سے قبل اندر سبھا پارسی تھیٹر میں
پیش ہو چکی تھی [illegible] خورشید ایک [illegible] ہے جو [illegible] میں لکھا گیا تھا
پروفیسر [illegible] اور [illegible] قائم
[illegible] اردو کا پہلا ڈراما [illegible] لکھا اور
اسٹیج کیا گیا تھا۔ [illegible] دیباچہ [illegible] لکھتا ہے کہ انہوں نے

یہ ڈراما اردو بھری ہندی میں تحریر کیا ہے۔ یہ ڈراما چونکہ ... کا ڈراما ہے اور دوارکا ناتھ کے بنگالی ڈرامے "شرت سروجنی" کا آزاد ترجمہ ہے۔ ان معانی میں "سجاد سنبل" کو اردو کا پہلا ڈراما نہیں کہا جا سکتا۔

اردو ڈراما کی تاریخ کی ترتیب نو کی شدید ضرورت ہے۔ ڈینوگ کے تلاش کردہ "شجیع الدولہ" کے بارے بہت سی معلومات ادھوری ہیں۔ نواب احمد فاروقی کے تلاش کردہ ڈرامے کے مصنف، ڈرامے کے نام اور تاریخ تصنیف کی تفصیلات سے ہم واقف ہیں۔ "راجہ ادھا اور کنھیا کے قصہ" کے سن تصنیف سے ہم لاعلم ہیں۔ ہندی ڈراموں کی تاریخ کے بہت سے ڈراموں کو اردو ڈرامے کی تاریخ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے ڈرامے کے سرمایہ کا از سر نو جائزہ لینا ہے اور ایک معتبر تاریخ مرتب کرنا ہے۔ ٭

ڈاکٹر قمر رئیس دہلی۔

بنگلور کی شام

شاداب و حسین روشن و پر کیف مدام — نم ریز ہواؤں میں بہاروں کے پیام
پھولوں کی لچکتی ہوئی شاخوں کی طرح — اک رقص کا انداز لئے ہیں اجسام
نشتر سے ہم آغوش نگار تہذیب — باغات کے پہلو میں معطر در و بام
ہے کوچہ و بازار میں محفل کا سماں — محفل میں عجب حسن ادا حسن کلام
رنگین و صندلکوں میں حسین ہر پیکر — ہر رنگ کا پیکر ہے چھلکتا ہوا جام

ہر شام دعا کرتا ہوں دلی میں قمر
اتنا یاد نہ آئے مجھے بنگلور کی شام

غیر اردو، ہندی داں طلبہ کی اردو تعلیم

کے چند بنیادی مسائل

ڈاکٹر قمر رئیس، ریڈر ۔ دہلی یونیورسٹی

اردو اساتذہ اور اہل علم کے اس اجتماع میں تمہید کے طور پر ان معروف حقائق کی طرف اشارہ کرنا ضروری نہیں، جن کا سامنا غیر مادری زبان کے طور پر کسی زبان کی تدریس یا اسکو سیکھنے میں ناگزیر ہوتا ہے مثلاً اس زبان کے مخصوص کردار اور منفرد صوتیاتی نظام سے واقفیت اور اس کی نامانوس آوازوں کو صحیح مخرج سے ادا کرنے کے آداب صوت کی تربیت ۔ یا اس مخصوص تہذیبی ماحول اور معاشرت سے شناسائی جس کی ترجمانی زبان کرتی ہے ۔ اسی طرح اس موقع پر لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے اردو کے مخلوط صوتیاتی اور حرفی نظام کا تجزیہ بھی ضروری نہیں ۔ یہ حقائق اور ان سے وابستہ دشواریوں کا ہم سب کو احساس ہے ۔

میں یہاں اس سیمینار کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف ان مسائل اور ان دشواریوں کا ذکر کروں گا جو بالغوں کی سطح پر ایک اجنبی زبان کے طور پر اردو کی تدریس میں عموماً پیش آتی ہیں ۔ تاکہ تبادلۂ خیال کے ذریعہ ان کا حل تلاش کرنے اور اس حیثیت سے اردو کی تدریس و تعلیم کے کام کو آسان اور بہتر بنانے کی تدابیر کی جا سکیں ۔

لیکن اس سے قبل کہ مسائل کا ذکر کیا جائے اردو زبان کی تدریس اور زبان دانی کے مقصد اور معیار کا تعین ضروری ہے ۔ تاکہ غلط اندیشی کی گنجائش نہ رہے ۔ بالغوں کی سطح پر ہندوستان اور دوسرے ممالک کی دانشگاہوں میں اردو زبان سکھانے کا نصاب ایک سال سے پانچ سال تک کی مدت پر پھیلا ہوا ہے ۔ سوویٹ یونین کی درسگاہوں میں بالعموم یہ کورس پانچ سال کا ہوتا ہے ۔ جب کہ ہندوستان، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں اس کورس کی میعاد ایک سال سے دو سال تک ہوتی ہے ۔ سوویٹ یونین میں بھی زبان کی تدریس کا بنیادی کام دو سال

میں ختم کر دیا جاتا ہے۔ اسکے بعد طلبہ کو تاریخ، معانیات اور ادبیات کے گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اردو سیکھنے والے طلبہ ہندی اور انگریزی بھی لازمی طور پر پڑھتے ہیں۔ اسکے علاوہ وہ اپنے گروپ کے تعلق سے ہندوستان کی تاریخ، اقتصادیات یا پھر اردو شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقفہ میں بھی طلبہ کی اردو زبان کی تعلیم اور مشق جاری رہتی ہے۔ بولنے پڑھنے اور لکھنے پر یکساں طور پر زور دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر دو سالہ مدت کو زبان سیکھنے کی میعاد فرض کیا جائے تو سوال یہ ہوگا کہ اس مدت میں طالبعلم سے زبان دانی کے کس معیار اور کس سطح کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ اس دوران وہ اپنی تمام تر توجہ اور وقت کو اسی کام پر صرف کرے گا۔ ظاہر ہے کہ استثنائی صورتوں سے قطع نظر طالب علم بول چال کی عصری زبان سے ہی واقفیت بہم پہنچا سکتا ہے۔ زبان کی ساخت اور قواعد کے اساسی اصولوں سے روشناس ہونے کے علاوہ ایک تخمینہ کے مطابق وہ اس مدت میں ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار الفاظ تک کا استعمال سیکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ Basic English اور Essential English کے مرتبین نے زبان شناسی کے جو معیار رکھے ہیں اس کا علم بنیادی انگریزی سے یقیناً دوچند ہوگا اور Essential انگریزی سے کچھ کم ہوگا۔ وہ روزمرہ زندگی کے امور پر گفتگو کر سکے گا۔ اردو کے روزناموں کی خبریں اور عام اداریے بھی لغت کی مدد سے پڑھ سکے گا۔ لیکن تخیلی ادب کے نمونوں شاعری اور ڈرامہ وغیرہ کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ابھی اس میں پیدا نہیں ہوگی۔ اسی طرح قدیم زبان اور محاوراتی زبان مثلاً نذیر احمد اور سرشار کے ناول اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں بھی ابھی اسکی دسترس سے دور ہونگی۔

دو سال کی تدریسی مدت میں ایک بالغ طالبعلم سے زبان دانی کے جس معیار کے حصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں تک ترقی یافتہ یورپی زبانوں کا تعلق ہے یہ معیار آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اردو کے سلسلہ میں اس معیار کے حصول میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ اردو زبان کے غیر ملکی طلبہ اور اساتذہ تقریباً متفق الرائے ہیں کہ یورپی زبانوں یہاں تک کہ فارسی اور ترکی جیسی زبانوں کے مقابلہ میں اردو سیکھنے اور سکھانے کا کام نہیں زیادہ دشوار ہے۔ اور ایک طالبعلم مذکورہ زبانوں میں دو سال کے وقفہ میں جیسی مہارت اور قدرت حاصل کر سکتا ہے اردو میں باوجود محنت اور انہماک کے پانچ سال میں بھی حاصل نہیں کر پاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوسرے اساتذہ کا تجربہ کیا ہے۔ لیکن میرا تجربہ اور تاثر اس سے زیادہ

مختلف نہیں ہے۔ اور میری دانست میں اس صورت حال کا اصل سبب یہ نہیں کہ اردو
دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مشکل اور پیچیدہ زبان ہے بلکہ صرف یہ کہ اردو
زبان سیکھنے اور سکھانے کے لئے وہ بنیادی سہولتیں میسر نہیں جو دوسری زبانوں کو
[illegible] رسم خط، صوتیات اور صرف و نحو سکھانے کے لئے جس جدید
علمی انداز [illegible] کوئی سنجیدہ اور نتیجہ خیز تحقیق ہوئی ہے اور نہ ہی اس
میدان میں اساتذہ کے تجربات اور تحقیق سے فائدہ اٹھا کر دوسری زبان کی مختلف
سطحوں کے لئے مستند اور معقول کتابیں ہی لکھی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس
[illegible] کے پیچھے تنگ نظری، تعصب اور [illegible] کا وہ جذبہ اور
[illegible] کار فرما رہا ہے جو اردو کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے اور جس میں خود ہم اہل
اردو بھی شریک ہو گئے ہیں۔

غیر زبان کے طور پر اردو سیکھنے اور سکھانے کا سب سے پہلا مرحلہ اس کے
رسم خط اور نظام صوتیات سے شناسائی ہے۔ رسم خط یوں تو زبان میں استعمال ہونے
والی آوازوں کا جامع اشارہ ہوتا ہے لیکن اردو کے مخصوص کردار کی وجہ سے اس کے
حروف تہجی میں ہم آواز حروف کی تعداد [illegible] قابل لحاظ ہے۔ اسلئے غیر ہندی علاقہ یا غیر
ممالک کے اردو طلبہ رسم خط سیکھتے ہوئے تین طرح کے حروف تہجی سے دو چار ہوتے ہیں،

۱. ایسے حروف جنکی آوازیں انکی مادری زبان اور اردو میں مشترک ہیں۔
۲. ایسے حروف جنکی آوازیں انکے لئے نئی اور اجنبی ہیں۔
۳. ایسے حروف جو مذکورہ دو قسم کے حروف کے ہم آواز ہیں۔

ایسے طلبا جو اپنی مادری زبان کی آوازوں سے مانوس اور انکی
ادائیگی پر قادر ہو چکے ہیں انکے لئے سب سے زیادہ دشواری دوسری قسم کے حروف
اور ان سے زیادہ انکی اجنبی آوازوں کو سیکھنے اور ادا کرنے میں پیش آتی ہے۔ اور ان
پر قدرت حاصل کرنے میں انھیں طویل مشق اور تربیت درکار ہوتی ہے۔ تیسری قسم
کے حروف [illegible] اعتبار سے کوئی علاحدہ امتیازی حیثیت نہیں رکھتے اسلئے انکو
[illegible] اور انکا معنوی فرق جاننے کے لئے ایک حرف کے طور پر ہی
سیکھا جاتا ہے۔ جہاں تک اردو حروف تہجی کا تعلق ہے ایک بالغ طالب علم [illegible]
کے مقابلے میں نسبتاً کم وقت میں ان سے روشناس ہو جاتا ہے مگر [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] الفاظ کی معنوی تہہ داری انکے تہذیبی تلازمات اور صرفی و نحوی [illegible]
[illegible] کی زیادہ [illegible] رکھتا ہے۔
[illegible] کہ اردو رسم خط سیکھنے اور لکھنا [illegible] زیادہ دشوار

حروف کے جوڑنے اور ملانے کا عمل ہے۔ جو نستعلیق کی صورت میں ایک فن کی حیثیت
رکھتا ہے۔ یہاں تک ایک حرف کی اپنے ماحول یعنی لفظ میں محلِ استعمال کی مناسبت
سے کئی کئی صورتیں ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کی کرسی، نشست، دائروں، شوشوں اور نقطوں
کا اہتمام۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دوسری زبانوں میں بھی، مثلاً روسی اور انگریزی
میں، ایک ایک حرف کی تین تین اور کہیں چار صورتیں ہوتی ہیں۔ جنھیں الگ الگ یاد
رکھنا طالب علم کے لئے لازمی ہوتا ہے لیکن ہاتھ کی لکھائی اور چھپائی کی صورت میں ان
کی یہ مختلف شکلیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ جب کہ اردو میں یہ بدلتی رہتی ہیں اور
کبھی کبھی ایک ہی لفظ میں ایک حرف کی تکرار مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔
ممکن ہے مادری زبان کے طور پر اردو سیکھنے والے طلبہ اس سے زیادہ پریشانی محسوس
نہ کرتے ہوں لیکن یہ واضح ہے کہ دوسرے طلبہ کے لئے یہ مرحلہ دشوار گزار ہوتا ہے۔
اسی لئے وہ نستعلیق کے مقابلہ میں نسخ کو زیادہ آسان اور سلجھا ہوا پاتے ہیں۔ ایک
زمانہ تھا جب اردو کے عام طالب علم کے لئے خوشخطی کی مشق بھی لازمی مضمون
کی حیثیت رکھتی تھی اور مشق کے لئے بازار میں اس سلسلہ کی درجہ بدرجہ کتابیں بھی
دستیاب ہو جاتی تھیں۔ صرف نستعلیق ہی نہیں خط شکستہ کی مشق بھی ضروری تھی۔
لیکن اب یہ کاروبار بند ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو رسم خط سیکھنے اور
حرفوں کو جوڑنے کی مشق کا کام جو ایک ماہ کی مدت میں ختم ہو جانا چاہیئے کئی ماہ
تک پھیلتا چلا جاتا ہے جو وقت اور جو محنت طالب علم کو زبان کے اہم
ضروری پہلوؤں کو سمجھنے اور سیکھنے میں صرف کرنا چاہئے رسم خط کی نذر ہو جاتی ہے۔
اس کے باوجود وہ اس اعتماد، مہارت اور حسنِ تحریر سے محروم رہتا ہے جو اس سے کم
وقت میں وہ دوسری زبانوں کے رسم خط سیکھنے اور لکھنے پڑھنے میں حاصل کر لیتا ہے۔
اردو رسم خط سیکھنے کے عمل کو زیادہ آسان، سادہ اور دلچسپ بنانے
کے لئے حال ہی میں حیات اللہ انصاری، شمشیر بہادر سنگھ اور دوسرے
اساتذہ نے نئے نئے طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ جو اپنی افادیت کی وجہ
سے پسند کئے گئے ہیں۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ ان کے پیش نظر صرف ہندی داں
طلبہ کے مسائل تھے جو اردو رسم خط سیکھنا چاہتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اپنی
کتاب "اردو املا" میں اس سلسلہ کی کچھ مشکلات کا حل پیش کیا ہے۔ جہاں تک غیر
ہندی داں یا غیر ملکی طلبہ کی تدریس کا تعلق ہے ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا
جا سکتا ہے لیکن یہاں ضرورت ایک دوسرے انداز نظر اور طریق کار کی ہوگی۔
جہاں تک اردو زبان کے صوتیاتی تجزیے اور اس کے ابتدائی اسباق کا تعلق ہے -

اردو کی تعلیم کا تعلق ہے اس میدان میں گذشتہ دنوں کچھ کام ضرور ہوا ہے، لیکن تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ابھی اس کی جو بہت ابتدائی درجے میں ہے۔ جستجو Experimental ہی ہے۔ اردو آوازوں کی درجہ بندی اور ان کے مطالعہ کے ذریعہ کا ابتدائی کام ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کیا تھا۔ اب Phonemics کے نقطۂ نگاہ سے بھی اردو کے مصمتوں اور مصوتی ڈھانچہ کی تفہیم و تجزیہ کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں زبان شناسوں کے نتائج فکر میں اختلاف ہی نہیں خلط مبحث بھی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر گیان چند جین اردو زبان کے فونیمس Phonemes کی کل تعداد 37 اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پچاس قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میدان میں سائنسی نقطۂ نظر کے ساتھ مزید تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو کے فونیمس اور ان کے گرافیمس (یعنی تحریری علامتوں) کا باہمی رشتہ اتنا پیچیدہ نہیں جتنا کہ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں ہے۔ انگریزی میں فونیمس کی کل تعداد 46 اور حروف تہجی کی تعداد 26 ہے۔ یعنی کئی ایک حرف سے زیادہ اور حروف علت سے کئی کئی فونیمس کو ادا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ تاہم ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے کہ لفظوں میں فونیمس کی تعداد حروف تہجی سے زیادہ ہو۔ اکثر حروف تہجی کی تعداد ہی الفاظ میں فونیمس سے زیادہ ہوتی ہے۔

اردو میں بھی ایک ہی حرف سے کئی فونیمس کو ادا کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ دشواری 'و' اور 'یے' کے ساتھ ہے۔ جو کئی مصوتوں اور دو مصوتوں کی علامت ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے بے شک ان آوازوں کے حامل الفاظ کو پڑھنے اور لکھنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوتی لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اردو سیکھنے والے دوسرے طلبہ کو ان آوازوں کو یہاں تک کہ جو دو ان مصوتوں Diphthongs کو بھی ادا کرنے یا انکی مشق بہم پہنچانے میں اتنی پریشانی اور الجھن کا سامنا نہیں ہوتا جتنی پریشانی کا سامنا ان آوازوں کے حامل الفاظ کو مطبوعہ یا غیر مطبوعہ صورت میں صحت کے ساتھ پڑھنے میں ہوتا ہے۔ وہ رشوت کو رشوت، بیر کو پیر اور میرا کو میرا پڑھتے ہیں۔ 'لوٹ'، 'لوٹ' اور لوٹ یا پیٹ، پیٹ اور پیٹ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اور چونکہ اردو اخبارات یا عام مطبوعہ کتابوں میں اعراب یا دیرا ؤ کی آواز کے لئے الٹا پیش لگانے کا اہتمام نہیں ہوتا ہے اسلئے ان ذرائع سے اردو زبان سیکھنے کی کوشش میں بڑی دقتیں حائل ہوتی ہیں۔ ان میں نون غنہ کی مختلف صورتوں کو پڑھنے اور ادا کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔

اور یہ سب اسلئے کہ غیر مادری زبان کے طور پر اردو سیکھنے کی ضرورتوں اور مقاصد کو سامنے رکھ کر
درسی کتابیں، ریڈریں اور دوسرا مواد تیار کرنے اور فراہم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے
جہاں تک اردو کی بنیادی آوازوں یا فونیمس کا تعلق ہے۔ آوازوں کی واضح تقسیم اور انکے صحیح مخارج
کے علم سے انکی ادائیگی میں کچھ مدد ضرور مل سکتی ہے لیکن زبان سیکھنے میں اصل اہمیت ان آوازوں
کو ادا کرنے کے لئے آلات صوت کی تربیت مشق اور ریاضت کی ہے۔ جس کے لئے لنگوافون اور
اسپیچ ٹریننگ کے ریکارڈوں کا استعمال یقیناً زیادہ نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو سیکھنے کے
لئے اس طرح کا کوئی مواد دستیاب نہیں۔ جس کی کمی کا شدید احساس دوسرے ملکوں کے اساتذہ،
اور طلبہ کو خصوصیت سے ہوتا ہے اور اس کوتاہی کے نتیجہ میں ان کی زبان دانی کا معیار بھی پست رہتا ہے۔

اردو زبان کی تعلیم کا اصل کام دراصل اسکے صرفی اور نحوی نظام کے مطالعہ کا کام ہے۔ اس سلسلہ
میں یوں تو قدیم کلاسیکی، ڈائرکٹ اور جدید لسانیاتی تین بنیادی طریق کار مانے گئے ہیں لیکن واقعہ
یہ ہے کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے ان میں سے کسی ایک طریق تعلیم کی تفصیلات اور اصولوں کو اب
تک کوئی منظم شکل نہیں دی جاسکی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب
کی قواعد کے علاوہ اردو زبان کی کوئی جامع توضیحی گرامر بھی مرتب نہیں ہو سکی۔ عبدالحق صاحب کی قواعد
اردو کے عام طلبہ کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کی افادیت مسلم لیکن وہ غیر ہندی علاقہ کے طلبہ
کی امداد اور رہنمائی زیادہ دور تک نہیں کرتی۔

مثال کے طور پر اردو میں جنس یا تذکیر و تانیث کے مسئلہ کو لیجئے جو ایک محنتی طالب علم کے لئے
بھی اکثر بڑی پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی، عربی اور فارسی سے ماخوذ اسما
کی شناخت کے جو چند قاعدوں کی وضاحت کی ہے وہ غیر ہندی علاقہ یا ملک غیر سے تعلق رکھنے والے
ایک طالب علم کے لئے بہت ناکافی ہیں۔ چونکہ جنس کی رعایت سے واحد اور جمع دونوں صورتوں میں،
فعل بھی بدلتا ہے اسکے علاوہ حروف ربط حروف تشبیہ اور بعض صفات بھی بدل جاتی ہیں اسلئے
طالب علم کبھی بھی اسم کی جنس معلوم کئے بغیر نہ تو جملہ بنا سکتا ہے نہ بول سکتا ہے پھر یہی نہیں اردو میں
ایسے اسما کی تعداد بھی خاصی ہے جو اپنے ایک معنی میں مذکر ہیں تو دوسرے میں مونث۔ مثلاً آب
بمعنی پانی مذکر بمعنی چمک مونث۔ عرض بمعنی گذارش مونث ہے بمعنی چوڑائی مذکر۔ لگن بمعنی برتن
مذکر ہے بمعنی تعلق خاطر مونث۔ اس سے مزید الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ روسی عربی اور بعض دوسری
زبانوں میں بھی جنس کا مسئلہ خاصہ دشوار ہے۔ مسئلہ ... اور روسی زبان میں تیسری جنس کے اسما

کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اسکے باوجود طالب علم کو اردو میں زیادہ دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اردو کے بیشتر اسما کی جنس کا تعین سماعی ہے۔ وہ کسی قاعدہ کے پابند نہیں۔ اس لئے یہاں خاص توجہ اور مشق کے بغیر طالب علم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ غیر ہندی داں اردو طلبہ کے لئے مختلف مدارج کی جو درسی کتابیں تیار کی جائیں انہیں بول چال کی زبان میں کثرت سے استعمال ہونے والے اسما کو شامل کیا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نقطہ نگاہ اور سائنسی طریقہ سے اردو میں اب تک الفاظ شماری کا کوئی معقول اور مستند کام بھی نہیں ہوا ہے۔ تذکیر و تانیث کے موضوع پر آفاق بنارسی یا جلال لکھنوی نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں یا جو مستند لغات ہیں اس مقصد کے لئے نصاب کی تیاری میں ان سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے

طالب علم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسالہ تعلیم کے دوران اردو صرف و نحو کی تمام تفصیلات سے نہ سہی اسکے بنیادی ڈھانچہ سے ضرور واقفیت بہم پہنچا لے گا۔ جہاں تک عربی اور فارسی سے ماخوذ الفاظ مصادر اور انکے مشتقات کا تعلق ہے انکے کچھ واضح اصول اور قاعدے ہیں جن کا سمجھ لینا دشوار نہیں ہوتا۔ لیکن انہیں سے اکثر کی ضرورت اس سطح پر نہیں بلکہ اعلیٰ اور زیادہ شائستہ زبان سیکھنے کی سطح پر پیش آتی ہے۔ پھر بھی چونکہ بول چال کی زبان میں بھی کم سہی ان کا چلن ہے اور جس فارسی یا عربی قاعدوں کی بنیاد پر اردو میں قیاسی الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں۔ جیسے تذکرہ کے وزن شکریہ یا اشلاف کے وزن پر خراج جیسے الفاظ یا فرمائش اور آزمائش جیسے حاصل مصدروں کے انداز پر رہائش پیدائش اور گرمائش جیسے حاصل مصدر اسلئے اس سطح پر کچھ اہم قاعدوں کا سکھا دینا بھی ضروری ہوگا۔

اس سطح پر طالب علم جو زبان سیکھتا ہے اس میں سب سے زیادہ دقت اسے مرکب افعال کے استعمال میں پیش آتی ہے۔ جو اردو زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو میں افعال مرکبہ کی بے شمار صورتیں ہیں اور وہ بول چال کی زبان میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ افعال زمانی ذہنی اور خارجی حقائق اور کوائف کے نازک اور دقیق پہلوؤں کے طور پر یہ افعال دیکھئے۔ کہنا۔ کہہ دینا۔ کہہ لینا۔ کہہ اٹھنا۔ کہہ ڈالنا۔ کہہ گزرنا۔ کہہ چکنا۔ کہتے رہنا۔ کہتے جانا۔ کہتے چلنا۔ کہتے بننا۔ دیکھنا۔ دیکھ لینا۔ دیکھ ڈالنا۔ دیکھتے رہنا۔ دیکھے جانا۔ دیکھا کرنا۔

یہاں کہنا اور دیکھنا جیسے افعال کے ساتھ جو دوسرے مصادر ہیں اور ان کی ترکیب سے اصل فعل یعنی کہنے اور دیکھنے کے معنی میں جو نازک فرق پیدا ہوتا ہے اہل زبان

اسکو بخوبی سمجھتے ہیں لیکن ایک ایسا طالب علم جسکی مادری زبان اردو یا ہندی نہیں ہے ان مرکب افعال کے باہمی فرق کو سمجھنے میں سخت دشواری محسوس کرتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کے صیغوں میں ان کے معنی تلاش کرتا ہے اور نتیجہ میں مزید غلط اندیشی کا شکار ہوتا ہے۔ پھر یہی نہیں اس طرح کے مرکب افعال تین تین اور چار چار افعال پر بھی مشتمل ہوتے ہیں مثلاً سجایا کرتے رہنا۔ سجاتے جلتے رہنا۔ دیکھ لیا کرنا۔ تمنا عمادی نے۔ جنھوں نے اردو کے افعال مرکبہ پر ایک کتاب لکھی ہے۔ مرکب افعال کی مختلف صورتوں سے بحث کی ہے۔ انکے علاوہ اس موضوع پر سوویٹ ماہرین زبان سونیا چیرنی کووا اور رحمان بیردی محمد جانوف نے بھی قابل قدر مقالے لکھے ہیں۔ اور کوشش کی ہے کہ انہی زبان کی نحوی ساخت کی حدود سے باہر نکل کر اردو کے مرکب افعال اور انکے صیغوں کے معنی سمجھائیں۔ دراصل اردو گرامر کا یہ بہت سخت مرحلہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ قواعد سے دلچسپی رکھنے والے حضرات غیر زبان داں طلبہ کی ضروریات کو سامنے رکھ کر مرکب افعال کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں اور عام بول چال میں استعمال ہونے والے افعال مرکبہ کا تجزیہ زمانی اور طوری اعتبار سے کریں۔ میری ناقص رائے میں جب تک علمی ڈھنگ سے یہ کام نہیں ہوگا اردو زبان کی تدریس کا کام ناقص ہی رہے گا۔

اردو کی تعلیم میں ایک بڑی دشواری جو غیر زبان داں طلبہ کو پیش آتی ہے وہ بعض حروف ربط کا استعمال ہے۔ اہل زبان کے لئے بے شک یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن غیر ہندی داں یا غیر ملکی طلبہ اردو کے جملوں میں نے۔ سے۔ کو۔ پر۔ میں جیسے حروف کے صحیح استعمال میں خاص دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ایک طرف وہ ان کے صحیح محل استعمال کا سراغ نہیں لگا پاتے تو دوسری طرف ان کی اپنی زبان کی عادتیں غلط فہمیاں پیدا کرتی ہیں۔ "نے" اردو میں علامت فاعلی ہے۔ لیکن یہ متعدی افعال کے ماضی کے صیغوں میں تو آتا ہے لیکن حال اور مستقبل میں استعمال نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اس میں مستثنیات بھی بہت ہیں۔ جنکی طرف عبدالحق صاحب نے اپنی قواعد میں اشارہ کیا ہے۔

اس موضوع پر بعض سوویٹ ماہرین زبان نے کچھ علمی مقالے لکھے ہیں اور بعض کثیر الاستعمال صورتوں کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن دراصل ان حروف ربط کا استعمال اتنی گوناگوں شکلوں میں ہوتا ہے کہ ان سب کا احاطہ بہت دشوار ہے۔ خاص طور سے ان کی محاوراتی صورتیں۔ مشکل یہ ہے کہ گرامر کے یہ مسائل اہل زبان کو متوجہ ہی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر حرف "سے" کے استعمال کو لیجئے جو اساسی طور پر کسی چیز یا کام کے آغاز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کل صبح سے بارش ہو رہی ہے۔

مجھے اس سے کیا تعلق ؟

وہ ذرا سختی سے بولا۔

وہ سفر سے واپس آ گیا۔

دل سے دُعا نکلتی ہے۔

محنت سے پڑھو

وہ کانوں سے بہرا ہے

تم اپنی بات سے پھر گئے۔

وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔

صبر سے کام لو۔

حرکت جمود سے بہتر ہے۔

ان میں سے چند مثالیں عبدالحق صاحب کی قواعد سے مستعار ہیں۔ انہیں مزید اضافہ بھی ممکن ہے۔ چند کو چھوڑ کر بیشتر صورتوں میں یہاں "سے" کا استعمال اس کے بنیادی معنی سے کچھ ہٹ کر ہوا ہے۔ یہ انحراف اکثر طالب علم کو چکرا دیتا ہے۔ ان دشواریوں کا صحیح احساس عملی تدریس کے دوران ہی ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور دوسرے قواعد نویسوں نے ان حروف ربط کے محل استعمال کے سلسلہ میں جو اشارے کئے ہیں میرا خیال ہے کہ اگر ان خطوط پر تحقیقی کام کیا جائے تو بعض ایسے بنیادی اصولوں، مستثنیات اور محاورات کی وضاحت ہو سکتی ہے جو ہندی سے ناآشنا طلبہ کی تعلیم کے لئے ضروری ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بول چال کی عصری زبان اخباری زبان سے قریب تر ہوتی ہے اور اس میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے۔ چنانچہ عام طلبہ گرامر کے بنیادی ڈھانچہ اور لفظیات کے کچھ ذخیرہ سے روشناس ہونے کے بعد روزناموں کے مطالعہ اور اخباری زبان کے ترکیبی تجزیہ سے زبان سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اکثر یہ طریق کارسودمند ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں دو مشکلات ہیں۔ اول تو یہ کہ اردو کے بعض مشہور روزناموں میں بھی زبان کی صحت کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی کثرت سے راہ پا جاتی ہیں۔ دوسری اس سے کہیں زیادہ اہم دشواری یہ ہے کہ طالب علم اردو کے عام روزناموں میں (ان میں بہ تب

شامل نہیں) ایسے بے شمار الفاظ پڑھتا ہے جو اردو کی کسی بھی لغت میں نہیں ملتے۔ ایک سوویت اسکالر تش مرزا خانم زانف نے گزشتہ پچیس سال کے اردو اخبارات کا سروے کر کے ایسے چھ سو الفاظ جمع کئے ہیں۔ جو اردو اخبارات میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں لیکن اردو کی کسی لغت میں دستیاب نہیں ہوتے۔ یہ نئے الفاظ کچھ تو ہندی کے سرکاری اور رابطہ کی زبان ہونے کے اثر سے دبے پاؤں اردو زبان میں داخل ہوتے رہے اور کچھ سائنس ٹکنالوجی اور صنعت و صناعت کی تیز رفتار ترقیوں اور عام زندگی میں ان کے نفوذ و اثر سے در آئے۔ ایسے الفاظ بھی ہیں جو نئے سیاسی حالات نے وضع کئے ہیں جیسے گھیراؤ۔ سماج واد۔ نو بیا نہ دل بدلی لوک ناٹک وغیرہ۔ یہ الفاظ اگر زندہ عصری زبان کا ایک حصہ ہیں۔ تو انکو لغت میں آنا چاہئے۔ دراصل اردو میں ایسی ایک بھی جدید لغت موجود نہیں جس میں بیسویں صدی میں اردو زبان کی توسیع و ترقی اور اسکے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کا احاطہ کیا گیا ہو۔ فرہنگ آصفیہ جو حال ہی میں دوبارہ شائع کی گئی ہے اس کی تدوین بھی انیسویں صدی کے آخر میں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ایسی دشواری ہے جس کا حل آسانی سے ممکن ہے بشرطیکہ اس کی طرف ہمارے اردو کے ادارے توجہ دیں اور اردو کے جدید لغت کی بنیاد عصری زبانوں کے سروے پر رکھی جائے۔

آخر میں غیر ہندی ہندی داں یا غیر ملکی طلبہ کی ایک ایسی دشواری کا ذکر کرنا چاہوں گا جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں جاتی۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ صرف دو سال ہی نہیں پانچ سال تک اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی طلبہ اردو کی گنتی پر قدرت حاصل کرنے اور اسے بولنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر پاتے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کی گنتی انگریزی فارسی روسی یا دوسری زبانوں کی طرح کسی قاعدہ کی پابند نہیں ایک سے سو تک ہر دہے کی ہر گنتی ایک علاحدہ اکائی ایک علاحدہ لفظ ہے۔ جس کو اسی حیثیت سے الگ الگ یاد کرنا چاہئے۔ جس طرح دوسری زبانوں میں دس یا بارہ تک کی گنتی کے بعد ہر دہے کی ایک علاحدہ ردیف ہوتی ہے اور ایک سے نو تک کی گنتی کو دہرایا جاتا ہے اردو میں وہ صورت نہیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اردو کی گنتی کے تلفظ کی معیار بندی نہیں ہوتی۔ مختلف علاقوں میں تلفظ کے فرق سے قطع نظر خود ماہرین زبان بھی کسی ایک تلفظ پر متفق نہیں مثلاً پنڈت دتاتریہ کیفی اگر 48 کو اڑتالیس اور 58 کو پچپاسی کہنے اور لکھتے ہیں تو دوسرے ماہرین زبان اڑتالیس اور پچاسی کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ دوسری گنتیوں کے تلفظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اس میں غلط

بھی زیادہ اور صداقت بہت کم ہے ۔ اردو کی گنتی بھی دوسری گنتیوں کی طرح ایک قاعدہ کی پابند ہے ۔ لیکن اسکے تلفظ کی عدم معیار بندی نے التباسات اور الجھنیں پیدا کردی ہیں۔ دوسرے یہ کہ مستثنیات کی تعداد دوسری گنتیوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہے ۔ تاہم یہ دشواری ایسی نہیں ہے کہ جس پر قابو نہ پایا جاسکے ۔ غیر زباں داں طلبہ کے لئے جو نصاب تیار ہوا اس میں گنتیوں کو منفصل لکھ کر درست کر کے قاعدے کی وضاحت کی جا سکتی ہے ۔ اور اگر ماہرین زبان متفق ہوں تو مستثنیات کو کم بھی کیا جاسکتا ہے ۔ اس میں کچھ بحث طلب مسائل بھی ہیں ۔ اگر گفتگو ہوئی تو میں اپنے تجربات اور خیالات کی کچھ مزید وضاحت کروں گا ۔

مجھے احساس ہے کہ غیر ہندی داں یا غیر ملکی طلبہ کو اردو سکھانے کے جن مسائل کا ذکر میں نے کیا ہے انکے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں ۔ اس مختصر مقالے میں میں نے اپنے تجربات کی روشنی میں جن کو قابل ترجیح سمجھا ہے صرف انکی طرف اشارہ کیا ہے امید ہے کہ اس اجلاس اور آئندہ اجلاسوں میں ان مسائل کے علاوہ دوسرے مسائل پر بھی غور و فکر کیا جائے گا ۔

غیر اُردو داں طلبائے کو اُردو پڑھانے کے مسائل

آپ تعجب نہ کریں اگر میں اپنی بات اس بیان سے شروع کروں کہ " غیر اردو داں طلباء " سے میری مراد وہ سیانے اور بچے ہیں جن کے والدین کی مادری زبان اردو ہے مگر جن کی اپنی زبان اردو نہ رہی ۔ چراغ تلے اندھیرا ہی رہتا ہے، نئی زمانہ ہمارے ساتھ یہی معاملہ ہے ۔ یہ حقیقت غالباً ہم نے اب تک محسوس نہ کی ہے کہ اُردو گھرانوں میں اردو مادری زبان نہیں رہی ۔

دوسرے صوبوں کا مجھے مشاہدہ نہیں ۔ یوپی، خصوصاً بہار میں صورت حال یہی ہے ۔ یہاں کے بیشتر اردو گھرانوں میں اُردو کی دو حیثیتیں ہیں ۔ والدین کے لئے یہ مادری زبان ہے مگر ان کی اولاد کے لئے یہ آمیختہ بن گئی ہے ۔ والدین اردو کو مادری زبان کہہ سکتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے بزرگوں سے اسے وراثت میں پایا ہے ۔ اردو انہیں صاف ستھری شکل میں ملی ہے ۔ وہ اردو کے فارسی اور عربی ورثے سے نابلد نہیں ہیں ۔ اردو املاء یا اردو صرف و نحو اُن کے لئے ،

کابوس نہیں ہیں ۔ مگر انہی گھروں کے بچے جو زبان بولتے اور لکھتے ہیں، وہ اردو نہیں۔ اُن کی بولی کو LANGUAGE کہنا زبان کی توہین ہے۔ ان بچوں کو روزانہ بول چال میں اپنے ساتھیوں سے، اپنے استادوں سے اور اپنے ہمسایوں سے جیسے ٹوٹے، اجڑے الفاظ و اصوات مل رہے ہیں، ان سے اردو کا تال میل نہیں ۔ اردو گھروں میں پروان چڑھنے والی یہ اُٹھتی کونپلیں جیسی اردو بولتی ہیں یہ اکھڑی اُجڑی زبان ہے۔ یہ ایسی اردو ہے جس کی ساخت بھی درست نہیں ۔ یہ ایسی ناشائستہ زبان ہے جس سے اردو کے تہذیبی اُفق پر تاریکی پھیل رہی ہے۔

۱۹۶۲ء کی بات ہے، میرے عزیز اور شاد عظیم آبادی کے شاگرد، پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی (سابق صدر شعبہ اردو و فارسی، سینٹ کولمبس کالج، ہزاری باغ) ہندوستان کو خیر باد کہہ رہے تھے۔ میں انہیں رخصت کرنے گیا۔ ترک وطن کی بات آئی۔ اُن کا جواب اب تک یاد ہے۔ بولے "میاں حسنین، یہاں رہ کر اس بڑھاپے میں اپنی زبان خراب کروں؟ گھر میں نانی پوتوں کی زبان سنتا ہوں تو کلیجہ اینٹھنے لگتا ہے۔ اسی گھر میں کبھی تم جیسے نوجوانوں کو تذکیر و تانیث کی تمیز سکھاتا تھا۔ اب ان بچوں کا منہ کیسے بند کروں جو صحیح لفظ بھی نہیں بول سکتے!"

آپ نے جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات پڑھی ہوگی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اُن دنوں ہندو ذہن کی تنگ دلانہ حب الوطنی (NARROW MINDED PATRIOTISM) سے یہ بہت آزردہ اور متفکر تھے۔ صورت حال کے تحت وہ ہندوستان میں اردو تہذیب کو پُرخطر محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف دیارِ غیر اُن کے لئے آنکھیں بچھا رہا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے جوش نے اس باب میں رائے لی۔ اُن کی فہمائش پر پھر انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے مشورہ کیا۔ جوش کے ترک وطن کے خیال پر پنڈت جی نے شدید کرب محسوس کیا۔ سوچنے کے لئے انہوں نے جوش سے دو دن کا وقت مانگا ۔ جوش راقم ہیں، خود ان کی زبانی سنیے ۔

"دو دن کے بعد جب پہنچا تو نظر اُٹھاتے ہی میں نے اُن کے دل موہ لینے والے چہرے پر اس قسم کی شگفتگی دیکھی جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ نگاہ اُٹھائی۔ شیریں تبسم لبوں پر مچلنے لگا۔ انہوں نے کہا۔ جوش صاحب میں نے آپکے معاملہ کا ایک ایسا اچھا حل نکال لیا ہے جسے آپ بھی پسند کریں گے۔ کیوں صاحب، یہی بات ہے نا کہ آپ اپنے بچوں کے تہذیبی مستقبل کو سنوارنے اور اردو زبان کی خدمت کرنے کے واسطے پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ جی

نے کہا، جی ہاں۔ اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے بچوں کو، پاکستانی بنا دیں اور آپ یہیں رہیں"۔

یہ بڑوں کا ردِ عمل ہے۔ میں اپنی کیا کہوں ــــ؟ اردو کا معلم ہوں! اردو کی روٹی کھاتا ہوں۔ اولاد کی تعلیم کا آغاز اردو سے ہوا۔ بعد میں انگریزی اسکول میں انہیں داخل کرایا۔ پنڈت رکھ کر سنسکرت پڑھوائی کہ ان کے ہندی داں ساتھی انہیں بگڑ کر نہ دیکھیں۔ اچھے اسکول اور کالج میں ان کی تعلیم انجام پائی۔ اردو ان کے گھر کی زبان رہی۔ اس پلاننگ کے باوجود، مگر اردو میری اولاد کی زبان نہ بن سکی ــ یہ دیکھ کر دل مسوس جاتا ہے کہ میرے جوان سال لڑکے انگریزی اخبار کی طرف پہلے ہاتھ بڑھاتے ہیں، اردو اخبار بعد میں اٹھاتے ہیں۔ ان کے خطوں کا رسم خط اردو ہوتا ہے مگر ان میں ہندی اور انگریزی کے مرجھائے الفاظ اولوں کی طرح گرتے رہتے ہیں ــــ یہ حقیقت ہے کہ اردو میری مادری زبان ہے، مگر میری دوسری پیڑھی اسے اپنی مادری زبان نہ بنا سکے گی! میں قصور کسے دوں؟ ذمہ دار کون ہے؟ میں جواب نہیں دے سکتا ــــ میں سمجھتا ہوں یہ میری نہیں، غالباً آپ کی بھی حسرت ناک کہانی ہوگی ــــ

اس صورتِ حال کے بموجب میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ فی زمانہ اردو پڑھانے کے مسائل غیر اردو داں طلبا سے ہی متعلق نہیں، اردو داں طلبا سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ بلکہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے، عصری بحران اور بے اطمینانی نے اسے غیروں سے زیادہ ہمارے بچوں کا اہم مسئلہ بنا دیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر گفتگو سے پہلے چند حقائق آپ کے سامنے رکھ دوں۔ ان حقائق کی روشنی میں قدم اٹھانا مفید ہوگا۔ ذہن صاف رہے گا اور الجھنیں غور و فکر میں مانع نہ ہوں گی۔

۱۔ آزادی کے بعد قومی بساطِ تہذیب و ادبیات پر "اردو" کا منصب بدل چکا ہے

۲۔ آزادی سے پہلے تمام علاقائی زبانوں کا مقابلہ صرف ایک زبان سے تھا، جو غیر ملکی زبان تھی۔ کسی واحد زبان کو ترویج و ترقی کی راہ میں کوئی فوقیت یا فضیلت حاصل نہ تھی۔

۳۔ ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک چوتھائی طبقہ پڑھا لکھا ہے، مگر اس ملک کی تقدیر ناخواندہ جمہور سے نتھی ہے۔ کوئی واحد زبان، اس لئے جمہوری مزاج کو قبول نہ ہوگی

۴۔ ہر زبان، اپنا مخصوص علاقہ رکھتی ہے مگر اردو کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔

۵۔ ہندی علاقوں میں بھی، ہندی، بول چال کی زبان SPOKEN LANGUAGE

نہ بن سکی۔ یہ منصب مقامی بھاشاؤں (LOCAL DIALECTS) کو حاصل ہے

علیحدہ، متحدہ ہندی، کا چلن محض نظام درس اور سرکاری انتظامیہ میں ہے۔

۶۔ بولنے والوں کی اکثریت رہتی ہے اور پڑھنے والوں کی اقلیت۔ بڑی سے بڑی طاقت بھی اس اقلیت کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

۷۔ زبان کی ناپائیدار قوت اس کے تکلمی کردار سے قائم رہتی ہے۔ یہ قوت بول چال سے بڑھتی ہے، تحریر سے نہیں بڑھتی ہے۔ اردو کے تکلمی کردار میں جیسی توانائی ہے، دوسری ملکی زبانوں کو یہ نصیب نہیں۔

۸۔ ہم بولنا پہلے سیکھتے ہیں اور لکھنا بعد میں، تلفظ کا مسئلہ اس لئے تحریر سے بہت پہلے سامنے آجاتا ہے۔

۹۔ اردو اپنے فارسی رسم خط کی وجہ سے دوسری تمام علاقائی زبانوں سے دور ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ اردو کا اپنا کلچر ہے جو اس کے رسم خط کے علاوہ زبان و ادب سے جھلکتا رہتا ہے۔

۱۱۔ اردو کلچر دن بہ دن ایک بڑے طبقے سے چھوٹتا اور ایک چھوٹے طبقے میں سمٹتا جا رہا ہے۔

۱۲۔ "تعلیم" اپنے معیار و مقاصد کے پیش نظر نہایت تیزی سے زوال پذیر ہے۔

آپ اعتراف کریں گے، یہ حقیقتیں روز و شب جیسی صداقتیں ہیں۔ ان سے چشم پوشی

61890 یا ان کے اچھے اور برے نتائج سے بے خبری انتہائی مضر ثابت ہوگی۔

14.6.77

آئیے اب اصل موضوع پر بات کی جائے 8h غیر اردو داں طلبہ کو اردو پڑھانے کے مسائل۔ اس موضوع کے تین پہلو ہیں، اردو زبان، اردو زبان کی تعلیم اور اردو پڑھنے والے طلباء۔ ___ تعلیمی مسائل اور طلباء کے مسائل عام ہیں کچھ ہمارے مخصوص نہیں۔ دوسری بڑی ریاستیں اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک بھی ان الجھنوں میں مبتلا ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ہمارا اپنا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری زبان ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ سیدھی کون ہے؟ سمجھ بوجھ سے کام لیکر عزم کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ آزادی کے بعد قومی بساط تہذیب و ادب پر اردو کا منصب بدل چکا ہے اردو ادب کسی شہر کی ملک نہ رہی۔ اس زمانے میں کسی کو یہ دعویٰ نہ ہوگا کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا!! یہ انداز فکر گزرے دنوں میں بھی نامناسب تھا اور ان دنوں انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ بہر حال اس میں دو رائے نہ ہوگی کہ اس صدی کی دوسری چوتھائی کی اردو ابتدائی چوتھائی کی اردو سے بہت

دور جا چکی ہے اور یہ دوری زبان کی تنگی سے زیادہ تنزلی کا مظہر ہے۔ آج اردو کے نام پر ہمارے بچے کچھ دوسری زبان سیکھ رہے ہیں ـــــ ہمارے معاشرہ میں شیخ الہا... ڈاکٹر مسعود حسین خان کے الفاظ میں "گونگی بہری نسلیں" تیار ہو رہی ہیں زبان کا معاشرہ اور کلچر سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ زبان سے دوری کلچر اور ادب سے دوری ہے اور اس دوری کا نتیجہ انتہائی مہلک ہو سکتا ہے۔ ڈر ہے کہ یہ بے زبانی اور بے ادبی مستقبل قریب میں تخلیقی ادب کے لئے زہر ہلاہل نہ ہو جائے۔

اس وقت ہمارے سامنے ایک بڑا سوالیہ ہے، چمکتا اور بھیکتا سوالیہ! کیا اردو، پڑھنے اور بولنے والی یہ نئی پود اپنی اولاد کو اردو زبان کا وارث بنا سکتی ہے؟ کیا اردو اپنی موجودہ شکل میں زندہ رہ سکتی ہے؟ بڑا سنگین اور اہم سوال ہے یہ ـــ

صورت حال کے پیش نظر اردو تین صورتوں میں رائج ہے۔ ادبی، عوامی اور مرکبی۔ ادبی اردو تعلیم و تدریس کی زبان ہے۔ عوامی اردو غیر خواندہ جمہور کی بولی ہے۔ مرکبی اردو وہ زبان ہے جو نہ تعلیمی اداروں میں استعمال ہوتی ہے اور نہ کتابوں میں نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود یہ پڑھے لکھے گھروں کی زبان ہے ـــ

ادبی اردو اپنا گراں قدر اور مہتم بالشان سرمایہ رکھتی ہے۔ عوامی اردو یا بازاری زبان کا لیبے ادب ہے۔ یہ قلم اور قواعد دونوں کی دسترس سے آزاد ہے۔ لیکن اس کا دائرہ عمل ادبی اور مرکبی اردو سے زیادہ وسیع ہے۔ جس کا سبب اس کے تکلمی وصف کی قوی الاثری ہے۔ یعنی بازاری اردو ہر زبان کے جاندار الفاظ کو بے اختیار اپنے تصرف میں لے لیتی ہے۔ یہ الفاظ اپنا حسب نسب کھو کر محض اپنی صوتی اور معنوی پذیرائی کی وجہ سے عوام کی زبان اور ذہن پر مسلط ہو جاتے ہیں

مرکبی اردو ان دونوں سے الگ زبان ہے۔ یہ ادبی اردو اور عوامی اردو کا مکسچر ہے۔ یہ زبان ایک طرف خواندہ طبقہ سے میل جول رکھتی ہے اور دوسری طرف اس کا ڈانڈا ناخواندہ جمہور سے ملا ہوا ہے۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، مرکبی اردو کا چلن ان گھروں میں ہے جہاں مادری زبان کا دار دورہ تھا۔ وہ مادری زبان جو اپنا تہذیبی ورثہ رکھتی ہے۔ وہ مادری زبان جس کا کلچر دن بدن ایک بڑے طبقہ سے چھوٹتا اور ایک چھوٹے طبقہ میں سمٹتا جا رہا ہے۔

ہم جب اردو کی بات کرتے ہیں، نظام درس میں اس زبان کے حق و فرض پر غور کرتے ہیں، تو ہمارے پیش نظر ادبی اردو ہوتی ہے۔ مگر حالات کے دھندلکے میں شاید ہمیں صاف

نظر نہیں آتا کہ چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے! اردو گھر اور باہر خطروں میں گھری ہے۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق جھجک نہ ہوگی کہ فی زمانہ اردو کا ادبی روپ میں چلنا اور پنپنا آسان نہیں۔ اس کا دائرہ عمل تنگ ہو رہا ہے۔ پڑھنے والے بچے ہوں یا سیانے، خواندہ ہوں یا ناخواندہ میرا مشاہدہ ہے کہ اردو ادبی رنگ و آہنگ کے ساتھ ان کے تکلم یا تحریر میں جگہ نہیں بنا سکتی۔

دوستو!

اردو کی یہ بدحالی بادی النظر میں خطرہ کا احساس پیدا کر رہی ہے۔ مگر، یہ بگڑتی اور بدلتی ہوئی کیفیت دراصل زندہ زبان کی نامیاتی قوت کی دلیل ہے — عقل متقاضی ہے کہ اس بگاڑ میں سدھار کی کوشش کی جائے اور وقت کھڑے پاؤں یہ آواز دے رہا ہے کہ اس ابتری کو بہتری میں جلد تبدیل کر دو!

میرا مشورہ ہے کہ اردو کو "عامی" بنانے کی کوشش کی جائے، اسے عوامی نہ بننے دیا جائے۔ عوامی استعمال اور عامی استعمال یعنی COMMON USE اور COMMONER'S USE نئی بات نہیں — زبان و الفاظ کے اس نامیاتی پہلو سے حالی بھی بےخبر نہیں — اپنے مفید مقدمہ میں جہاں انہوں نے بہت سی اچھی بات کہی ہے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ جو غلط الفاظ* جو عوام اور جہلا کی زبان پر جاری ہوں، یہ عوامی ہیں اور ان کو ترک کر دینا واجب ہے۔

عامی اردو سادہ اور سہل زبان ہوگی — نئی اردو، جدید اردو یا آسان اردو جس نام سے آپ پکاریں، یہ زبان الف نا یے ہندوستانی ہوگی — یہ معرّب اور مفرّس اردو نہ ہوگی — اپنے فارسی رسم خط کے باوجود یہ اردو مقبولِ عام ہوگی اور ہندوستان کے کسی گوشہ یا شہر میں، ایک اجنبی کو گونگا اور بہرہ نہ ہونے دے گی — یہ زبان سواد اور سند مستعملات (USAGES) سے حاصل کرے گی — اس میں مستثنیات (EXCEPTIONS) کا جھمیلا نہ رہے گا — اپنی صحت و سلامتی کی خاطر یہ عرب و ایران کی جانب نظر نہ اٹھائے گی۔

ساتھ ہی میں یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہتا ہوں کہ ادبی اردو کی تعلیم کو میں پسند نہیں کرتا۔ یہ میری نیت نہیں۔ ادبی اردو کی عظمت و گرانقدری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس زبان میں ہمارا شاندار علمی، ادبی اور تہذیبی سرمایہ ہے۔ یہی ہمارے بزرگوں اور ہمعصروں کی مادری زبان ہے اسی سے تخلیق کاری کے سوتے پھوٹتے اور افکار و تاثرات کے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔ صرف اردو والے ہی نہیں، وہ افراد بھی جن کی مادری زبان پنجابی، بنگالی یا دوسری زبانیں ہیں، وہ بھی معترف

* خواص و عوام دونوں کی زبان پر جاری ہو جائیں عامی ہیں اور ان کا استعمال جائز ہے اس کے برخلاف وہ الفاظ

ہیں کہ چھپتی نہیں ، بے مقصد ہے یہ کافر نگی ہوئی (ایسے نام ایک دو نہیں درجنوں ہیں جن کی تصنیف وتالیف کی یہی زبان ہے)۔

تو میرا مقصد ادبی زبان کی جلا وطنی نہیں ۔ اس زبان کو اور اس کے ادب کو معیار اقدار کے ساتھ زندہ رکھنا میں مقدس فرض تصور کرتا ہوں ۔ ہاں نظام درس میں ادبی اردو کے بجائے عامی اردو کو میں اساسی حیثیت دیئے جانے کا طرف دار ہوں اور ادبی اردو کو خصوصی اردو کے نام سے جاری رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں ۔ اپنے ہوں یا پرائے اردو پڑھنے والوں کیلئے ابتدائی اور ثانوی زینے میں ذریعۂ تعلیم نئی اردو ہونا چاہیے ۔ خصوصی اردو کالجوں میں آرٹس کے طلباء کیلئے ایک لازمی مضمون ہوگی ۔ سائنس اور کامرس کے طلباء کے لئے لازمی مضمون کا حق عامی اردو کو دینا ہوگا ۔

بات نئی ہے ، ناممکن نہیں ۔ یہ موضوع پچھلے پچیس ۲۵ برسوں سے میرے فکر کا جزو بنا ہوا ہے ۔ اپنے مشاہدات و خیالات سے میں آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں ۔ نئی اردو یا عامی اردو کیا ہوگی ؟ ادبی اردو سے اس کا کیا تعلق رہے گا ۔ ؟ ان پہلوؤں پر وضاحت سے گفتگو کی ضرورت ہے ۔

زبان شناسی میں پہلا زینہ اسکرپٹ ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو اسکرپٹ پچھلے کئی برسوں سے تذکیرو تبصرہ کا سبب رہا ہے ۔ کہا جاتا ہے :۔

۱۔ اردو زبان اپنے فارسی رسم خط کی وجہ سے دوسری ملکی زبانوں سے دور ہو جاتی ہے
۲۔ اردو اسکرپٹ سائنٹفک نہیں ہے ۔ اس کا سیکھنا بہت دشوار ہے ۔
اس لئے مشورہ یہ ہے کہ اردو کے فارسی اسکرپٹ کو ترک کر دینا چاہیئے ۔

افسوس ہے کہ ان مباحث میں افراتفری زیادہ اور غیر واقعیت کم ہے ۔ یہ انداز فکر اعتدال پسندانہ نہیں ۔ اسکرپٹ کے مسئلہ پر آج سے نو ۹ برس پہلے انجمن کی دہلی کانفرنس کے موقع پر میں نے کہا تھا :۔

"رسم خط اور زبان کا تعلق جسم اور پوشاک کا نہیں ، یہ جسم اور جلد کا ہے ۔ جاندار کی جلد اتار دینا شیطانی منصوبہ ہے ، جسے ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ اردو ایک زندہ زبان ہے ۔ اسے سہل اور مقبول بنانے کے لئے ہم اس کے رسم خط میں اصلاح کی بات کر سکتے ہیں ، رسم خط تبدیل کرنے کا مشورہ نہیں سن سکتے ۔

ماہرین لسانیات کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی زبان سائنٹیفک اسکرپٹ کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔
اُردو کیلئے پھر رسم خط کی تبدیلی یا ترک کا سوال کیوں؟ یہ مشورہ کسی صورت میں ہمیں منظور نہ ہوگا۔

دراصل، اُردو پڑھنے والوں کی دشواری اس کا رسم خط نہیں، اس زبان کا املا ہے۔ حروف شناسی اور زبان خوانی میں اردو املا یقیناً ایک دردِ سر ہے۔ بچہ ہو یا سیانا، ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، اردو سیکھنے میں اس زبان کے املائی انتشار سے وہ فوراً دوچار ہوتا ہے اور بُری طرح الجھتا ہے۔ اِس کی پہلی مصیبت کسی لفظ کو رسم خط کے بموجب صحیح طور پر لکھنا اور پڑھنا ہوتی ہے۔ صحیح اور غلط کی صحت میں مقتدی کے کیوں اور کیسے کے متواتر سوالات سے سمجھ دار معلم بھی لاجواب رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ املائی انتشار سے اردو زبان کی صحت و سلامتی کو گھن لگ رہا ہے۔ ہمیں اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔۔۔ اِس ضمن میں وزارتِ تعلیم حکومت ہند کا اردو ترقی بورڈ قابلِ ستائش ہے کہ املائی انتشار پر قابو پانا اب ہمارے لئے امرِ دشوار نہ رہا۔ میری مراد رشید حسن خاں کی گرانقدر تصنیف کی اشاعت ہے ۔۔ اردو املائی صحت و سلامتی کیلئے یہ بروقت سبیل نہایت مفید ثابت ہوگی۔

اصلاح رسم خط کے ذکر میں آپکی توجہ ایک دوسرے امر کی طرف مبذول کرنی چاہتا ہوں جو اُردو کے حروفِ تہجی اور اُس کے صوتیاتی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید طریقۂ تعلیم میں، آپ جانتے ہیں، سمعی طریقہ کو بصری طریقہ سے زیادہ مفید مانا گیا ہے۔ یعنی، اب جدید تعلیم میں معلم بچوں کو حروف اور الفاظ کی اصوات سے پہلے آشنا کراتا ہے، اُن کی صورتوں سے بعد میں واقف کراتا ہے ۔۔۔ یہ طریقہ فطری بھی ہے کہ ہم بولنا پہلے سیکھتے ہیں لکھنا بعد میں ۔۔۔ عام زندگی میں اسی لئے تلفظ کا مسئلہ املا سے بہت پہلے سامنے آجاتا ہے ۔

اردو حروفِ تہجی میں عربی الاصل حروف کی تعداد نو ہے، ث ح ذ ص ض ط ظ، ع ق ۔۔۔ ہمارے ابجدی قاعدوں میں آپ نے غور کیا ہوگا، اِن حروف کی صورت شناسی میں جو تصویریں دی جاتی ہیں، اُن کا بچوں کے روز و شب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً وہ اپنی کتاب میں:

ث سے ثمر   ح سے حقہ   ذ سے ذوالفقار   ص سے صراحی
ض سے ضعیف   ط سے طوطا   ظ سے ظروف   ع سے عینک
ق سے قینچی

کی خوش رنگ تصویریں دیکھتا ہے۔ اِن تصویروں کو دیکھ کر بچے کے دماغ میں بالکل دو سرے بلکہ متضاد اصوات ابھر آتے ہیں۔ یعنی، وہ ثمر کی تصویر دیکھ کر پھل اور عینک دیکھکر چشمہ سوچتا ہے، اور ایسا سوچنا بچے کا غیر ارادی ذہنی عمل ہے۔ (ان تمام عربی النسل حروف سے متعلق تصویروں میں صرف طوطا اور تیتلی ڈوایسی تصویر ہے جو اُس کیلئے اجنبی نہیں ہوتی)۔

بچے کی دوسری مشکل پھر اِن حروف کی اصوات ہوتی ہیں۔ وہ ث س ص یا ط ت یا ز ذ ض ظ یا ع ء کی صوتیات ادا نہیں کرسکتا، بلکہ اِن ہم آہنگ حروف کے لطیف صوتی امتیاز پر قدرت شاگرد اور عام معلّم دونوں کیلئے آسان نہیں۔

ضرورت ہے کہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے اُردو کو سہل بنایا جائے اور اس مقصد کے تحت اُردو کے اِن حروف کو جو زبان شناسی میں رخنہ ڈالتے ہیں، ابتدائی تعلیم کی منزل سے الگ کردینا مفید ہوگا۔۔ اردو صوتیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بجا لکھا ہے کہ ذ ظ ض ط ث ص ح جیسے عربی النسل حروف صوتی نقطۂ نظر سے "مردہ لاشیں ہیں جنھیں اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اس لئے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔۔۔" موصوف ادیب ہیں اور ماہر لسانیات بھی۔۔۔ اُن کے اس قول میں علمی بصیرت اور عملی تجربات کی جیسی روشنی اور پختگی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذاتی طور پر میں اُن کے اِس خیال سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔۔۔

اُردو زبان کی یہ صوتیاتی بے قاعدگی غالبًا سب سے پہلی بار سعادت یار خاں رنگین کو کھلی۔ ہمارا یہ بدنام زمانہ شاعر جسے مشہور زبانوں پر دسترس حاصل تھی، جو اُس عہد کی مقامی بولیوں کے علاوہ ترکی، فارسی، اور عربی جیسی غیر ملکی زبانیں جانتا تھا، بلاشبہ بہت دوربین اور حقیقت پرست تھا۔ اردو کو سہل بنانے میں رنگین کی سبقت تاریخی ہے۔ اس نے اردو کے املائی انتشار کو محسوس کیا۔ اسے دور کرنے کی کوشش کی اور اپنی تحریریں اسی املا کے بموجب اپنے قلم سے لکھیں۔ کلیات نورتن رنگیں، سعادت یار خاں کا وہ خود نوشت مخطوطہ ہے جس میں رنگین کے پیش کردہ املا کے یہ نمونے ملتے ہیں:۔

تانیث (تانیس) ظرافت (زرافت) موئنث (معنس) طبل (تبل) فوراً (فورن) رنگین کے یار غار میر انشاء اللہ خاں انشاء میں بھی لسانیاتی شعور کم نہ تھا۔ مگر اُن کی ذہانت وخطانت سے اُردو کے تشکیلی کردار کو وہ توانائی نہ مل سکی جو مرزا غالب، میر امّن اور سید احمد خاں

کی نثر نے بخشی ۔

اردو کی ان لسانیاتی اصلاحوں میں اس صدی کا ایک اہم نام ڈاکٹر سید جعفر حسن ہے اُردو زبان کو سہل بنانے میں ان کی کوششیں ہمیشہ یادگار رہیں گی ـــــ مرحوم کا خیال تھا کہ ہم جسطرح بولتے ہیں اسی طرح لکھیں۔ جن حروف کی خاص آوازیں ہم ہندوستانی ادا کرنے سے قاصر ہیں، انہیں اپنے حروف ہجی کی فہرست سے نکال دینا احسن ہے۔ اس بارے میں وہ اپنے اگلوں سے دو قدم آگے نکل گئے ہیں یعنی، املا کے علاوہ ہجا میں بھی انہوں نے اجتہادی قدم اُٹھایا مثلاً

خُد (خود) خُش (خوش) خاہش (خواہش)

اسی اصول کے تحت وہ اپنا نام " جافر ہسن" لکھا کرتے اور اسی طرح دستخط بھی کرتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب غیر ملکی اصوات ہمارے نطق سے میل نہیں کھاتے یا اُن سے مرکب اور مشتق الفاظ کے صحیح تلفظ پر فی زمانہ قدرت آسان نہیں ہے تو پھر اردو کی تعلیم میں بچوں یا بالغوں سے اُن اصوات کی ادائی کی ریاضت و محنت کیوں کرائی جائے؟ حروف شناسی میں اس بارِ گراں کو اُٹھانا کیا ضروری ہے؟ یہ غور طلب بات ہے کہ :-

ثقیل کے عوض کڑا	حصار کے عوض گھیرا	ذلیل کے عوض کمینہ
صالح ، سیدھا	ضعیف ، بوڑھا	طویل ، لانبا
ظالم ، کٹھور	عمل ، کام	قاتل ، خونی

جیسے چلتے پھرتے صاف ستھرے اور خالص ملکی الفاظ، کیا بول چال میں اور سماجی تعلقات کی استواری میں کارگر نہ ہوں گے ؟

اُردو کو آسان اور سہل بنانے میں بزرگوں کی یہ کوشش قابل توجہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اردو حروف ہجی سے ان تو حروف کو نکال دینے سے اردو رسم خط کی ہئیت بدل جانے کا احتمال نہیں ہے اور نہ اس اجتہادی اصلاح سے اردو زبان کی ترقی پر حرف آسکے گا۔

اس راہ میں ایک سوال دینی تعلیم کے ضمن میں اُٹھے گا یعنی، کہا جا سکتا ہے کہ نئی اُردو میں دینی تعلیم کیسے دی جا سکتی ہے؟ نئی اردو میں ممکن ہے دینیات کا اساسی لٹریچر تیار کر لیا جائے مگر کلام پاک کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟ اُردو زبان سے عربی الفاظ خارج کر دینے کے بعد کیا ہمارا بچہ سورہ فاتحہ بھی پڑھ سکے گا؟

یہ خدشہ عبث ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ نئی اُردو کے بعد ادبی اردو

کی تعلیم ختم کردی جائے۔ اردو نظام تعلیم میں نئی اردو کو اساسی حیثیت رہے گی خصوصی اردو کی حیثیت ثانوی ہوگی۔ طلباء کیلئے مادری زبان میں دینی تعلیم کا حصول قطعاً دشوار نہ ہوگا۔ بلکہ اسلامیات میں پختگی کی خاطر ادبی اردو میں موجودہ دینیاتی نصاب کے ابواب اُن کے لئے ہمیشہ وا رہیں گے۔

دوسرے، عربی النسل حروف کے اخراج سے یہ نتیجہ نہیں نکلنا کہ نئی اردو کی تعلیم سے بچے کے اعضائے نطق میں تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ ز۔ سے مماثل اصوات کی ادائی میں اسے ہرگز دشواری نہ ہوگی۔ حرف س کی شناسائی کے بعد ث، ص جیسے حروف کی تمیز میں اسے مشکل پیش نہ آئیگی ساتھ ہی یہ حقیقت کبھی نہیں نہ بھولنی چاہئیے کہ ان گھروں میں، جہاں اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں، بچوں کو عربی زبان نہیں پڑھائی جاتی بلکہ نیت خطِ عربی میں محض قرآن کا پڑھنا ہوتی ہے

آپ کہیں گے، ان حروف کے اخراج سے ہمارا اردو لغت منحنی ہو جائے گا۔ اور اردو الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ LUMBER-HOUSE کی شال ہو جائے گا۔ یہ گمان بھی حقیقت سے دور ہے۔ اردو کے الفاظ کا ذخیرہ فرہنگ آصفیہ کے بموجب چوّن ہزار نو ہے۔ ان میں ۳/۲ فیصد ہندوستانی الاصل الفاظ ہیں، ساڑھے پچیس فیصد عربی، فارسی، ترکی، ایرانی الفاظ ہیں اور ایک فیصد یوروپی الفاظ ہیں ـــــ یہ الفاظ آپ نہ بھولیں آج سے تقریباً اسّی برس قبل کے جمع کردہ ہیں۔ آج ہندوستانی الاصل اور انگریزی الفاظ کی مجموعی تعداد پچاسی ۸۵ اور نوّے ۹۰ فیصد سے کم نہ ہوگی۔

اردو خط ہماری زبان کا دوسرا اور دوسرا ہے جس کا دخل عمل تعلیم اور نظام طباعت دونوں میں سخت ہے۔ ہمارے حروف تہجی کی مجموعی تعداد ۳۹ ہے، مگر مکتوبی شکل میں ان حروف میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملکر یہ حروف اپنی مفرد شکل سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ب کی سات اور ع کی تین شکلیں ہو جاتی ہیں جیسے:

ب ـــ کباب بم بس باہر بند بہت لُو آبی

ع ـــ اطلاع معلوم اعلان مطلع

مفرد حروف کی یہ مختلف ٹوٹی شکلیں اردو سیکھنے اور لکھنے میں خاصی الجھنیں پیدا کردیتی ہیں۔

ہمارے یہاں دو خط عام طور پر استعمال ہوتے ہیں، خط نسخ و خط نستعلیق۔ خط نسخ میکانکی عمل ہے مگر نستعلیق محنت و ریاض چاہتا ہے۔ خط نسخ میں ٹائپ رائٹر کے علاوہ پریس کی وہ تمام سہولتیں حاصل ہوسکتی ہیں جو جدید طباعت میں عام ہیں۔ خط نستعلیق میں ان کا حصول ممکن نہیں مگر عملی زندگی میں حقیقت اس کے برخلاف ہے یعنی ہمارا واسطہ صرف خط نستعلیق سے رہتا ہے، خط نسخ ہم استعمال نہیں کرتے۔

اس لئے یہ سوال قابل غور ہے کہ نظام تعلیم میں خط نسخ رکھا جائے یا خط نستعلیق۔؟ یہی مسئلہ نظام طباعت میں در آتا ہے۔ اُردو طباعت ہنوز پرانے ڈھرے پر چل رہی ہے حالانکہ زمانہ قیامت کی چال چل پڑا ہے۔ خط نسخ اور خط نستعلیق کا بکھیڑا محمد سجاد مرزا پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد نے آج سے ۴۵ برس قبل حل کر دیا تھا۔ موصوف نے اپنی نگرانی میں بڑی جدوکد کے بعد حروف تہجی کیلئے ایک "بنیادی خط" تیار کرایا تھا۔ یہ بنیادی خط نسخ اور نستعلیق کے بین بین تھا جس میں حروف کی مفرد اور مرکب دونوں شکلیں دیدہ زیب ہیں۔ اس خط میں لکھنے اور پڑھنے میں بھی روانی، یکسانی اور آسانی تھی۔ اِس بنیادی خط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تعلیم اور طباعت دونوں لحاظ سے یہ قابل قبول ہوسکتا ہے۔

دوسرا کام ابجدی قاعدے کی تیاری ہے۔ یہ اظہار افسوسناک ہے اور عبرتناک بھی کہ اُردو میں انگریزی یا ہندی جیسے جاذب نظر، خوبصورت اور موثر قاعدے موجود نہیں۔ ہم ابھی تک عام طور پر قاعدہ بغدادی یا یسرنا القران جیسے قاعدوں سے صرف لیتے ہیں یا کبھی کسی دینی ادارے کا مرتبہ قاعدہ پڑھاتے ہیں۔ یہ روایتی قاعدے جدید نقطہ نظر سے مفید نہیں۔ یہ قاعدے، آپ اعتراف کریں گے گویا زیادہ ہیں گویا کم ۔

ابجدی قاعدوں کے ساتھ ایسی ابتدائی درسی کتابیں بھی تیار کرنی ہوں گی۔ جن میں بچے کی عمر کے بموجب لفظیات میں بتدریجی اضافہ کا لحاظ نیز الفاظ کے مفید العام ہونے کا خیال رکھا جائے۔ مفید العام سے مراد رسا الفاظ ہیں جن کا سماجی زندگی میں اُٹھنا بیٹھنا ہے یا جن سے متعلم کا رشتہ جلد نہیں ٹوٹتا۔ الفاظ وہ گراں قدر سکے ہیں جو ترسیل و ابلاغ میں کام آتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم میں مگر الفاظ کی ذخیرہ اندوزی نفع بخش نہ ہوگی۔ متعلم کے ذہن کو ایسے اجنبی اور ادق الفاظ سے بھر دینا جو عام ضرورت کے لائق نہ ہوں، ناقص تعلیم ہے۔ اسی ذہن الفاظ کی داد و دہش

مستحسن نہیں، بلکہ تعلیمی سال یا عمر کے بموجب متعلم کو خزانۂ الفاظ دینا چاہئے ۔ یہ کام ٹیپ ریکارڈس کی مدد سے بہت آسان ہو گیا ہے ۔ عام بول چال میں الفاظ کے تواتر کے بموجب ہر تعلیمی منزل کیلئے ایک جدید گرامر کی تیاری بھی ضروری ہے ۔

چلتے چلتے میں پھر اپنی بات دہرا دوں کہ نئی اُردو کو عامی بنانے کی کوشش کی جائے اسے عوامی نہ بننے دیا جائے ۔ میرا یہ مشورہ اُردو کی تعلیم اور نظام تعلیم دونوں جہتوں سے قابل توجہ ہے ۔ وہی نظام تعلیم قابل قدر ہے جو متعلم کی فطری صلاحیت کی شناخت اور اس کی صحت مند نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہو ۔ اُردو تعلیم میں بھی اسی وسیع النظری کی ضرورت ہے ۔ ہر کہ و مہ کی ادبیات اردو میں آنرس یا ام ۔ اے کی سند کی تمنا قابل ستائش نہ ہونی چاہئے ۔ لازمی تعلیم جس طرح حالات کا تقاضا ہے، اسی طرح نظام تعلیم میں اسکریننگ بھی وقت کا مطالبہ ہے ۔ بہتر اور مفید طریقۂ کار یہ ہوگا کہ ابتدائی اور ثانوی منازل تک اردو کی تعلیم کو عام کر دیا جائے ۔ سیکولرزم اور سوشلزم ہمارا قومی اور ملکی راستہ ہے ۔ اسی ملک کے تحت ماہرین تعلیم ایلیمنٹری اسٹیج میں سہ لسانی فارمولے کے اجرا پر زور دے رہے ہیں ۔ ہمارے لئے یہ اچھا موقع ہے ۔ اردو کے ذریعہ اس پروگرام میں کامیابی دشوار نہ ہوگی ۔

بزرگو اور دوستو !

ہواؤں نے رخ بدل دیا ہے ۔ ہمارے ارد گرد ناموافق حالات کا بڑھتا ہوا سیلاب ہے ۔ پانی کا تیز دھارا ٹخنوں تک آ چکا ہے ۔ شکر ہے کہ پانی کو روکنے اور باندھنے کی کوششیں بھی جاری ہیں ہمیں سمجھ اور احتیاط سے کام لینا چاہئے ۔ اس وقت ہر چیز کو بچانا ممکن نہیں ۔ ضروری اشیاء کو بھی فاضل جان کر چھوڑنا ہوگا ۔ اردو کی بقا اور ترقی میں اسی نظر و عمل کی ضرورت ہے ۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین
صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا

غیر اردو داں طلباء کو اردو پڑھانے کے مسائل

ڈاکٹر محمد حامد چھپروی
بہار یونیورسٹی

زبان ایک تہذیبی سرمایہ ہے۔ یہ قوموں کی ذہنی، فکری اور اجتماعی کوششوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ تہذیب و ثقافت کا یہی رشتہ زبان کو رنگ و آہنگ عطا کرتا ہے۔ زبانیں زندہ وجود کی طرح اردگرد کے مختلف اثرات کو قبول کرتی ہوئی ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ اسی لئے ہر زبان کا ایک مخصوص پس منظر اور لب و لہجہ اور ذہن ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی روح تک رسائی حاصل کرنے کیلئے ان تہذیبی اور ثقافتی نقوش کی شناخت ضروری ہے۔ تہذیب جب تک زندہ رہتی ہے زبان بھی اسکی علامت بن کر قائم رہتی ہے۔ تہذیبوں کے زوال کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی تاریک سائے منڈلانے لگتے ہیں ۔

اردو زبان ایک مخصوص تہذیب کی پیداوار ہے۔ اسکا ایک مخصوص پس منظر ہے۔ اس کی اپنی ایک ذہنی فضا ہے۔ اس لئے اردو کی تعلیم کا مسئلہ دراصل تعلیمی مسئلہ کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔ اس عہد میں جبکہ وہ مخصوص تہذیب مائل بہ انحطاط ہے۔ غیر اردو داں طلباً کو اردو پڑھانے کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ بن جاتا ہے۔ اسکا تعلق صرف تعلیم اور زبان کے مسائل سے ہی نہیں بلکہ اسکی بنیاد اس مخصوص تہذیب سے بیگانگی ہے جو آج ہمارے سماج میں عام طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو کہنے کیلئے اردو سب کی زبان ہے لیکن کھلی حقیقت یہ ہے کہ اسوقت غیر اردو داں طلباء دراصل غیر مسلم طلباء ہیں۔ یہ وہ طلباء ہیں جنہوں نے ایک ایسے سماج میں پرورش پائی ہے جس میں اردو کلچر کے نقوش بہت دھندلے ہو چکے ہیں۔ ان طلباء کی ذہنی ساخت انکا تہذیبی پس منظر اور انداز فکر قطعی مختلف ہے۔ وہ اس تہذیب اور ماحول سے بالکل ہی بیگانہ ہیں جس پر اردو زبان و ادب کی اساس ہے۔ اسلئے غیر اردو داں طلباء کو اردو پڑھانے کے سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی مسئلہ اس تہذیب سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرانا ہے۔ جب تک طلباء کو ان تہذیبی نقوش سے روشناس نہیں کرایا جائیگا اسوقت تک نہ تو وہ اردو زبان کے پڑھنے کے اہل ہو سکیں گے اور نہ ہی اردو ادب میں ان کی دلچسپی پیدا ہو سکے گی ۔

تدریسی اعتبار سے سب سے پہلی دشواری جو سامنے آتی ہے وہ ہے رسم الخط کی دشواری۔ اردو کا رسم الخط غیر اردو داں طلباء کے لئے یقیناً نامانوس اور بہت حد تک دشوار ہے۔ اردو املا کی دشواری اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اسکے رسم الخط کے بدلنے کی بات کرتے ہیں اور دیوناگری رسم الخط کے اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہاں رسم الخط کی بحث میں جانے کا موقع نہیں لیکن اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ رسم الخط کو الگ کرکے زبان کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اردو زبان اپنے رسم الخط کو ترک کرکے ایک زبان کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسلئے تعلیمی نقطہ نگاہ سے یہ لازمی ہے کہ اردو کی تدریس اسکے مروجہ رسم الخط میں ہو۔ اردو حروف میں جو آوازیں پوشیدہ ہیں۔ وہ دوسری زبان کے حروف کے ذریعہ ادا نہیں ہو سکتیں۔ رسم الخط کی تبدیلی زبان کے وسیع دائرے کو تنگ کردے گی۔ اردو املا کی دشواریاں تسلیم! لیکن "آم کے موسم میں جلسۂ عام" جیسے جملوں کے لکھنے کیلئے دوسری زبان کا رسم الخط اپنانے میں جس دلچسپ غلطی کا امکان ہے وہ ظاہر ہے۔ اساتذہ کو چاہئے کہ غیر اردو داں طلباء کو اردو پڑھاتے وقت رسم الخط اور املا کی ان بنیادی خوبیاں کی وضاحت کردیں۔ تاکہ وہ ان کی دشواریوں سے گھبرانے کے بجائے شوق اور انہماک کے ساتھ انکو سمجھنے کی کوشش کریں۔

غیر اردو داں طلباء کو اردو کی تدریس کے سلسلے میں ابتدائی سطح پر اتنی دشواریاں نہیں سامنے آتیں جتنی کہ اعلیٰ سطح پر۔ یہاں سب سے بڑی دشواری معنی و مفاہیم کے تفہیم کی دشواری ہے۔ اعلیٰ سطح پر ادب کی تعلیم کے سلسلے میں تشبیہوں استعاروں اور علامتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور چونکہ یہ ایک مخصوص تہذیبی پس منظر کی تخلیق ہوتی ہیں۔ اسلئے انکے پیچھے ایک مخصوص جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ اس جہانِ معنی تک رسائی حاصل کرنا غیر اردو داں طلباء کیلئے دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ اس پس منظر اور فضا سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اگر اساتذہ اردو زبان و ادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکے مخصوص تہذیبی کردار کی بھی وضاحت کرتے چلیں تو یہ مشکل بہت حد تک آسان ہو جائے گی۔

غیر اردو داں طلباء کیلئے ایک مخصوص نصاب کی ضرورت ہے۔ انکے لئے ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جانا چاہئے جو طلباء سے زیادہ سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی پیدا کرسکے۔ اس لئے ایسے ادب پاروں کا انتخاب کرنا چاہئے جس میں اردو زبان و ادب کی بہترین قدروں کے ساتھ ساتھ

مشترکہ کلچر کی واضح نمائندگی ہو۔ فارسی آمیز اندازِ بیان کے بجائے سادہ اسلوب اپنایا گیا ہو۔ نصاب کی ترتیب میں اس امر کا بھی خاص خیال رکھنا چاہئے کہ اردو ادب کے نمائندہ فنکاروں اور انکے فن پاروں کے ساتھ ساتھ تحریکات اور رجحانات سے بھی مناسب واقفیت ہو جائے۔ ابتدائی اور ثانوی سطح پر شاعری سے زیادہ نثر پر زور ہونا چاہئے۔ اعلیٰ سطح پر تمام اصنافِ ادب سے واقفیت ضروری ہے۔ جہاں تک جدید ادب کا تعلق ہے، چونکہ اسکے اندر کی ذہنی اور فکری فضا آج کے حالات کی پیداوار ہے اسلئے اس سے طلباء میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرانا زیادہ آسان ہے۔ غیر اُردو داں طلباء کے لئے جو نصاب تیار کیا جائے۔ اس میں جدید ادب کی اچھی خاصی نمائندگی ہونی چاہئیے۔ ہمارے یہاں عام طور پر نصاب کو ادبیات تک محدود رکھا جاتا ہے۔ لیکن غیر اُردو داں طلباء کیلئے نصاب میں زبان کی تعلیم پر بھی زور دیا جانا چاہئیے تاکہ قواعد، تلفظ اور انشاء کا علم حاصل ہو سکے۔

حضرات! ہم آج ایسے وقت میں غیر اُردو داں طلباء کو اُردو پڑھانے کے مسائل پر غور کر رہے ہیں۔ جب اُردو، خود اردو والوں میں غیر مقبول ہو رہی ہے۔ اور "کعبہ کے نگہبان" "بتکدوں" کے شیدائی بنتے جا رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اُردو کی تعلیم میں افادیت کی کمی ہے۔ جب کسی زبان کی تعلیم زندگی کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتی تو اسکا دائرہ سمٹنے لگتا ہے۔ غیر اردو داں طلباء کیلئے نصاب کی ترتیب میں اس پہلو پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے نصاب میں کچھ ایسی گنجائش پیدا کرنی چاہئے کہ انکا علم ریڈیو، اخبار، رسائل اور دوسرے کاروباری مقاصد کے لئے بھی کارآمد بن سکے۔

ڈاکٹر محمد حامد
شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی
راجندر کالج - چھپرہ
سارن - بہار

گھر کا پتہ
ڈاکٹر محمد حامد چھپروی
صفدر منزل، کریم چک
چھپرہ ۔ سارن
بہار

غیر اُردو داں طلباء کو اُردو پڑھانے کے مسائل

از ڈاکٹر ہارون ایوب

آپ تمام حضرات بخوبی واقف ہیں کہ باہمی میل جول کے نتیجے میں جس زبان نے آج سے چار سو سال قبل فوجی کیمپوں اور بازاروں میں جنم لیا تھا وہ آج کی اُردو ہے جس کے سبب مختلف تہذیبیں اور قومیں ایک دوسرے کے قریب آسکی ہیں۔ یہ ٹکسالی اور صاف ستھری زبان، برج بھاشا کھڑی بولی پنجابی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اشتراک سے بنی ہے جس نے بعد میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور اپنے اندر ایسے الفاظ جذب کرلیے ہیں جس کی اُسے ضرورت تھی ۔

یہ زبان جو ہماری اپنی ہے جس نے ہندوستان کی سرزمین میں جنم لیا۔ جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جو کسی مخصوص علاقے یا کسی مخصوص طبقے کی میراث نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ربط و اشتراک کی نشانی ہے جسے بلا امتیاز ہندوستان کا بچہ بچہ بولتا ہے۔

آج جب کہ دوسری زبانوں کے سیکھنے کا شوق دن بدن بڑھتا جارہا ہے اور اس کے لئے مختلف سائنسی طریقے اپنائے جارہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ بآسانی اسے سیکھ سکیں اُردو بھی انہیں زبانوں میں سے ایک ہے جس کی طرف تعلیم یافتہ طبقے کا رجحان جاگا ہے اور ایک بہت بڑی تعداد اس زبان کو سیکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ دراصل اردو کی غزل گوئی انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ اس زبان کو سیکھیں اور لطف اندوز ہوسکیں۔ آج اس زبان کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف ادارے قائم کیے جارہے ہیں جہاں لوگ آسانی کے ساتھ اردو سیکھ سکیں۔ نئے نئے تعلیمی نظام اور سائنسی طریقے اختیار کیے جارہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس زبان سے استفادہ کرسکیں۔ لیکن ابھی اردو کو بہت سارے مراحل طے کرنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُردو کے اساتذہ کو اس زبان کے سکھانے میں بہت ساری مشکلات درپیش ہیں جن میں سے چند کا ذکر آپ کے سامنے کررہا ہوں۔

کسی بھی زبان کو سیکھنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کو بولنے کی کوشش کی جائے یعنی اس زبان میں زیادہ سے زیادہ بات چیت کی جائے جبکہ آج کے دور میں یہ بہت ہی مشکل ہوتا جا رہا ہے علاقائی زبانوں کے علاوہ ہندی ضرورت سے زیادہ عام بول چال کی زبان میں استعمال ہو رہی ہے اور با محاورہ اردو بولنے میں خاصی رکاوٹ پیدا کرتی ہے، اور کوئی بھی شخص اچھی اردو اس وقت تک نہیں بول سکتا ہے جب تک کہ وہ اردو میں اچھی خاصی مہارت اور صلاحیت نہ پیدا کرے۔

جدید سائنسی طریقے اور لسانی طریقہ کار جو صوتیات کے سکھانے میں خاصے مددگار ثابت ہوتے ہیں اور جن سے دوسری تمام زبانیں پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں، لیکن اردو کی یہ بدقسمتی ہے کہ ابھی تک کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی ہے اسی لئے ہم آواز لفظوں کو لکھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے مثلاً طالب علم سوچتا ہے کہ طوطا "ت" سے لکھے یا "ط" سے، اسی طرح "س" کی آواز والے حروف کیوں نہ "ص" اور "ث" سے لکھے جائیں؟ یہی سبب ہے کہ اردو کے طالب علم ہجے کی لا تعداد غلطیاں کرتے ہیں، "ت" اور "ط" کی الجھن کے ساتھ ہی مقامی زبانوں کے اثرات کی وجہ سے تلفظ بھی صحیح ادا نہیں کر پاتے ہیں، جو زبانوں کی خوبی کو کھو دیتا ہے۔

ہم آواز الفاظ کے ساتھ اردو کا رسم الخط بھی خاصا مشکل ہے کیونکہ اس میں طالب علم کو کسی بھی حرف کی تین شکلیں یاد رکھنا پڑتی ہیں ساتھ ہی الفاظ کے جوڑنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ مشکل طلب ہے، پھر ٹائپ کے بجائے خط نستعلیق کا رواج عام ہے اس میں الفاظ کو خوبصورتی اور سہولت سے لکھنے کی وجہ سے نستعلیق نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے سبب ایک ہی حرف مختلف شکلوں میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً "ب" کو لے لیجئے اور تین الفاظ ایسے جمع کیجئے جو "ب" سے شروع ہوتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ تینوں لفظوں میں "ب" تین مختلف شکلوں میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً بادل - بلو - بم

اردو میں قواعد کی کوئی معقول کتاب نہیں ہے جو ابتدائی طالب علموں کے لئے مددگار ثابت ہو اس کے علاوہ فارسی اور ہندی دو زبانوں کے قاعدے اردو میں رائج ہیں۔ مثلاً جمع بنانے کا طریقہ جس کی مثال میں یوں دوں گا کہ "شاعر" کی جمع فارسی قاعدے سے "شعراء" اور ہندی قاعدے سے "شاعروں" دونوں ہی صحیح ہیں اور عام طور پر مستعمل ہیں لیکن طالب علم الجھ کر پوچھتا ہے، "دونوں کیوں صحیح ہیں" مگر ہم اس کو کوئی ایک اصول نہیں بتا پاتے ہیں۔

زبان کی ابتدائی مراحل کے بعد بھی جوں جوں طالب علم زبان سیکھتا جاتا ہے اس کے سامنے

نئی نئی الجھنیں پیدا ہوتی جاتی ہیں مثلاً "مرکب الفاظ" پھر ایک بار اس کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیتے ہیں، حالانکہ یہ اُردو کی امتیازی خصوصیت ہے اور کثرت سے بول چال کی زبان میں یہ مرکب الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مثلاً "ہم سفر"، "دل کش" وغیرہ، پھر یہی "مرکب الفاظ" کا املا طالب علم کو الجھا کر رکھ دیتا ہے، مثلاً ہم سفر کو ہی لیجئے، یہ دو لفظوں سے مرکب ہے، جو الگ الگ معنی رکھتے ہیں اور انہیں الگ الگ لکھنا چاہئے، لیکن پرانا طریقہ اس طرح کے الفاظ کے لئے یہ رائج ہے کہ اسے ملا کر لکھا جائے، جو نئے طالب علموں کے لیے الجھن کا باعث بن جاتا ہے اور طالب علم اسے غلط پڑھ جاتے ہیں مثلاً "آپ کا" اکثر جگہوں پر ملا کر لکھ دیا جاتا ہے اور ایک نیا طالب علم اسے آسانی سے آپکا پڑھ لیتا ہے۔

الغرض میں اپنے ناقص تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اُردو زبان سیکھنا اور سکھانا اتنا مشکل نہیں جتنا اسے محسوس کیا جا رہا ہے حالانکہ اس زبان کو ابھی وہ سائنسی سہولتیں حاصل نہیں جن کو دوسری زبانیں اختیار کر چکی ہیں اور جن سے بہت کم وقت میں زبان سکھائی جا سکتی ہے۔ تلفظ صحیح کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اگر طالب علم دو ہفتہ بھی دل لگا کر محنت کر لے تو وہ بہ آسانی رسم الخط سیکھ جاتا ہے، حرفوں کی شناخت سے واقف ہو جاتا ہے اور سست رفتاری سے پڑھ اور لکھ بھی سکتا ہے۔

اردو سیکھنے کے ابتدائی مراحل حالانکہ مشکل طلب ضرور ہیں جو بعض اوقات کسی کسی طالب علم کو بیدل بھی کر دیتے ہیں لیکن زبان کی شیرینی انہیں تمام مراحل سے گزار لاتی ہے، اتنا ضرور کہوں گا کہ طالب کو زیادہ سے زیادہ رائج کیا جائے اور مختصر نویسی یعنی ملا کر لکھنے سے پرہیز کیا جائے، ت، ط، ث س، ص جیسے ہم آواز الفاظ کے مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے۔ پھر یقیناً، اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ آسان اور کم سے کم وقت میں سکھائی جا سکتی ہے۔

میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے زبانوں کو سکھانے کی تمام سہولتیں اپنے مختلف سنٹروں کو فراہم کی ہیں جہاں بہ آسانی ہندوستان کی چودہ قومی زبانیں سیکھی جا سکتی ہیں۔ جن میں (اردو سکھانے کے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کے زیر نگرانی [illegible]) ادارہ سولن ہماچل پردیش میں بھی ہے جو اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر کے نام سے موسوم ہے، اسے حکومت ہماچل پردیش کی درخواست پر کھولا گیا ہے جس کا مقصد ہماچل پردیش کے اساتذہ کو اردو کی تعلیم دینا ہے تاکہ وہ اپنے اسکولوں میں واپس جا کر اپنے طالب علموں کو اُردو پڑھا سکیں، کیوں کہ ہماچل سرکار نے اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دے رکھا ہے

اور اسکولوں میں آٹھویں جماعت تک اردو لازمی ہے۔

غیر اردو داں طلبا کو اردو پڑھانے کے مسائل

از پروفیسر خسرو سہروردی
صدر شعبۂ اردو جمال محمد کالج
ترچنا پلی

دنیا کی وسعت کا تصور ختم ہوگیا ہے۔ آج دنیا اتنی وسیع نہیں رہی ہے جتنی کہ کل تھی۔ سفر کی رفتار کچھ اتنی تیز ہوگئی ہے کہ آج کا انسان تین دن کے اندر ساری دنیا کا چکر لگا سکتا ہے۔ وہ تصورات جنکی افادیت صدیوں سے مانی جاتی ہے آج یکسر بدل گئے ہیں اور وہ قدریں جنکی بنیادیں وقتی سچائی پر استوار کی گئی تھیں آج جھوٹ ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ دور انقلابی دور ہے۔ جسکو ہم خاموش انقلاب کا دور کہہ سکتے ہیں۔ تصورات اور قدروں میں اس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آرہی ہیں جن کے ساتھ چلنا آدمی کا مقدر ہوگیا ہے۔ اگر آج کے انسان کی تیز رفتاری میں ذرا سا بھی فرق آجاتا ہے تو وقت انسانوں کے قافلے کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل جائے گا۔ جہاں دنیا کی ہر چیز اس خاموش انقلاب سے متاثر ہوتی ہے۔ وہاں کلچر بھی متاثر ہوتے ہیں اور زبانیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ اردو زبان اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس زبان کے ناطے کئی مسائل اُٹھ کھڑے ہیں زبان کے پھیلاؤ اور اشاعت کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ جو ہمارے سامنے ہے وہ غیر اردو داں طبقے کو اردو سے واقف کرنے کا مسئلہ ہے

دنیا کی بڑی زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان زبانوں کو بڑا بنانے میں اہلِ زبان نے ایک اہم رول ادا کیا ہے دور کیوں جائیں انگریزی جو بڑی چھوٹی زبان تھی آج عالمگیر زبان بن گئی ہے۔ اسکی عالمگیریت کا راز غیر انگریزی داں طبقے کو انگریزی سے واقف کرانے میں مضمر ہے ورنہ یہ بالکل چھوٹے ملک کی بڑی ہی چھوٹی زبان عالمگیریت حاصل نہیں کر پاتی۔ ہمیں اس نکتہ پر زیادہ سوچنا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو زندہ رہے اور پھلے پھولے تو ہمیں چاہئے کہ غیر اردو داں طبقے کو اس زبان سے واقف کرائیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اس مدعا ہم

کیا کرنا ہے اس سلسلے میں سب سے اہم اور سب سے پہلا مسئلہ جو درپیش ہے وہ ہے اس زبان کا املا۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ زبان جتنی سادہ ہوگی زیادہ پھیل سکے گی۔ اس حیثیت سے ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا ہی ہوگا کہ ہماری زبان کا املا بڑا ہی پر پیچ اور مشکل ہے اسکے املا کی بھول بھلیّوں سے جہاں اہل زبان خود آسانی سے نہیں نکل سکتے ہیں تو بھلا وہ لوگ جو زبان سے بالکل ناواقف ہیں وہ کیسے اس ہفت خواں کو سر کر سکیں گے۔ اس کد میں ہمارے چند احباب کی کوششوں کو نہ سراہنا ایک ادبی لغزش رہے گی۔ قاضی عبدالستار صاحب مرحوم نے سب سے پہلے اس پر سائنٹفک انداز سے سوچا۔ اُن کی سوچ کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ ان کے بعد ابھی ابھی رشید حسن خاں نے "املانامہ" لکھ کر بہت سے مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ تمام ادارے اور انجمنیں جو اُردو کے لئے کام کر رہی ہیں ان سفارشات کو اپنائیں خصوصیت کے ساتھ آج کا اردو پریس جب تک ان کو نہیں اپنائے گا یہ کام سہل نہیں ہوگا۔ جب املا کا تعین ہو جائے گا تو، غیر اردو داں طلباء کو اردو پڑھانے کا مسئلہ بھی آسان ہو جائے گا اور یہ کشمکش کہ لفظ فوراً میں الف پر دو زبر لگائیں یا نہ لگائیں باقی نہیں رہے گی۔

موضوع کے تعلق سے دوسری اہم بات اِس کے نصاب کی ہے۔ سب سے پہلے ابتدائی کتابوں کا تیار کرانا ہے۔ اس سلسلے میں بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں کام تشفی بخش ہوا ہے سوائے اردو کے۔ تامل۔ بورڈ نے " TAMIL IN THIRTY DAYS " کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہوئی ہے اسمیں شک نہیں کہ یہ کتاب غیر تامل طلباء کے لئے بڑی، مفید ثابت ہوئی ہے۔ یہ کتاب زبان کے جدید تقاضوں کے پیشِ نظر لکھی گئی ہے۔ یہ کام تقریباً، ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہوا ہے۔ ویسے اردو میں بھی ایک دو کتابیں مل جاتی ہیں لیکن تشفی بخش نہیں ہیں۔ یہ کام ترقی اردو بورڈ کی مدد سے انجمن اساتذہ کے سپرد ہوا اور انجمن اساتذہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اس قسم کی کتابیں شائع کر دے گی تو یہ اردو کی سب سے بڑی، خدمت ہوگی۔ اس سے علاقائی زبانوں کے احباب کو اردو پڑھانے کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے اس سلسلے کی تیسری کڑی جو رہ جاتی ہے وہ ہے اسکا میڈیم۔ ہمیں سوچنا ہے کہ غیر اردو داں طلباء کو آخر ہم کس میڈیم میں پڑھائیں گے۔ میرے خیال میں انگریزی سے بہتر کوئی میڈیم نہیں ہو سکتا۔ اور انگریزی کے ساتھ علاقائی زبان کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی کتابوں میں تین زبانوں کا استعمال ہوگا۔ انگریزی، علاقائی زبان اور اردو۔ مثلاً تامل ناڈو کے غیر اردو داں طلباء کے لئے جو کتاب

ترتیب دی جائے گی اس میں انگریزی، تامل اور اُردو یہ تینوں زبانیں ہوں گی۔ حقیقت میں یہی اصل کام ہے جو ہمیں کرنا ہے۔ یہی کام اُردو زبان کو وسعت دے گا۔ اس سلسلے میں جامعہ ملیہ کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ عبدالغفار مدھولی اور ان کے رُفقا نے واقعی بڑا اچھا کام کیا ہے۔ لیکن یہ کام صرف انگریزی میڈیم سے ہو رہا ہے جس سے وہی احباب فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو انگریزی سے بخوبی واقف ہیں۔ میں یہاں سب سے زیادہ اہمیت علاقائی زبان کو دینا چاہتا ہوں علاقائی زبان کو اپنائے بغیر اردو کی اشاعت کا کام ادھورا رہ جائے گا۔ اس سلسلے کی چوتھی اہم بات ان طلبا کے لئے انگریزی اور علاقائی زبان کی مدد سے اردو لغت کا تیار کرنا ہے۔ اس کام کی پہل مرحوم نجیب اشرف ندوی نے کی تھی۔ پروفیسر گوریکر نے بھی بڑی خوش اسلوبی سے اسکو انجام دیا۔ ہمیں چاہئے کہ ہندوستان کی ہر بڑی زبان میں لغت ترتیب دیں تاکہ اسکی مدد سے غیر اردو داں طلبا زبان پر عبور حاصل کر سکیں۔ یہ کام بھی سردست ترقی اردو بورڈ کے ذریعے انجمن اساتذہ کی نگرانی میں ہو سکتا ہے۔ میں بار بار ترقی اردو بورڈ کا نام اس لئے لے رہا ہوں کہ مالی حیثیت سے یہی ایک ادارہ مستحکم ہے اور اس ادارے سے بڑی بڑی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جس سے صرف اردو جاننے والے ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس سے اردو کی اشاعت میں مدد نہیں مل سکتی۔ اگر ترقی اردو بورڈ اپنی تمام تر توجہات اسی پر مرکوز کرتا رہا تو اسکے نام میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی اور ترقی اردو بورڈ کو اپنے نام کا پہلا اور اہم جز نکال کر صرف اردو بورڈ رکھنا ہوگا۔ یہاں میں نے انجمن ترقی اردو کا نام عمداً نہیں لیا ہے کیوں کہ میں اس سے مایوس ہوں۔

اس ضمن میں علاقائی یونیورسٹیاں ہمارے کام آسکتی ہیں چند یونیورسٹیوں نے کام کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ مثلاً بورڈ آف اسٹڈیس کی سفارش پر مدراس یونیورسٹی نے اس کام کی پہل کی ہے۔ یونیورسٹی میں اردو ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورس کا اجرا کیا ہے۔ دو چار بیچیس (BATCHES) اب تک فارغ ہوئی ہیں۔ آئندہ تعلیمی سال سے یونیورسٹی کی جانب سے تامل ناڈو کے ان تمام کالجوں میں جہاں اردو کے شعبے قائم ہیں سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس کا اجرا ہوگا جسکی اجازت یونیورسٹی نے دے دی ہے۔ میرے اپنے کالج میں بھی اسکی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں آئندہ جولائی سے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک فال نیک ہے جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے ان کورسس میں غیر اردو داں طلباء کو اردو پڑھانے میں انگریزی کے علاوہ علاقائی زبان سے بھی مدد لی جائے گی۔ نصاب تیار ہو رہا ہے شاید بہت جلد مکمل

ہو جائے۔

دوستو! میں نے اپنے مقالے کا عنوان "غیر اردو داں طبقے کو اردو پڑھانے کے مسائل" اس لئے چنا ہے کہ یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے اور میرے دل کی آواز ہے۔ اردو کے تعلق سے جو بے سر و پا اعتراضات اور باتیں دنیا جہاں میں پھیلی ہوئی ہیں ان تمام کا ازالہ اسی سے ہو سکتا ہے جو ([illegible]) غیر اردو داں طبقے کے ذہن میں اردو کے تعلق سے قائم ہو گیا ہے وہ اسی کام سے دور ہو سکتا ہے اگر ہم نے سچے دل سے اور لگن کے ساتھ اس مد میں کوشش کی تو اس سے دو بڑے فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اردو کے تعلق سے جو غلط باتیں غیر اردو داں طبقے کے ذہنوں میں بیٹھ گئی ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ دوسرا یہ کہ اس سے اردو کی ہمہ گیریت میں اضافہ ہوگا اور اب تک ہم جو دعویٰ کرتے آئے ہیں کہ اردو ہمہ گیر زبان ہے یہ دعویٰ صحیح معنوں میں ثابت ہو کر رہے گا

دوستو! تقریباً سترہ سال سے غیر اردو داں طلباء کو اردو پڑھانے کا کام کرتا آیا ہوں اب تک مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے طالب علم ہمارے ادارے سے نکل چکے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ان میں چند طلباء آج دور دراز ملکوں میں اردو کی شمع جلائے بیٹھے ہیں مثلاً میرے ایک طالبِ علم ڈاکٹر جوسف، چارلس جو "ملایا یونیورسٹی میں ڈپارٹمنٹ آف زولوجی میں ریسرچ گائیڈ ہیں۔ وہاں اردو ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ انگریزی اور" ملایَن زبانوں" کی مدد سے وہ وہاں اردو پڑھا رہے ہیں۔ میری نظر میں یہی بنیادی کام ہے ہمیں اس پر زیادہ سوچنا ہے۔ اردو کی بقا اسکی ترویج اور اشاعت پر موقوف ہے۔ اگر سب کچھ کیا جائے اور مسئلہ کے اس رُخ کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہماری یہ سب سے بڑی بھول ہوگی۔ اور اس سے اردو کا دائرہ محدود ہو کر رہ جائے گا اور اسکے فطری سوتے خشک ہو جائیں گے جو اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہوگا۔

غیر اُردو داں طلباء کو اُردو[11] پڑھانے کے مسائل

یہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے اور غور طلب بھی۔ ہمیں ایسی کوئی صورت نکالنی ہے جس سے غیر اُردو داں طلباء کیلئے سہولتیں پیدا ہو سکیں اور انہیں اُردو سیکھنے میں آسانی ہو۔

کسی کام کے کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز مقصد اور لگن ہے۔ لگن کے بغیر ہم مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ غیر اُردو طلبہ کے لئے بھی اُردو پڑھنے کے لئے پیشِ نظر واضح مقصد ہونا چاہئے اور اس مقصد کے حصول کے لئے "ذوق و شوق"۔ میرے خیال میں یہ عمل دو طرفہ ہے۔ سیکھنے والے طلبا میں بھی اگر ذوق و شوق نہیں ہوگا تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ اس لئے پڑھانے والے کا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ وہ اُن طلبہ میں ذوق و شوق پیدا کرے جو اُردو سیکھنا چاہیں یہ کام آسان نہیں ہے۔ پڑھانے والے اور پڑھنے والوں میں گہرا تعلق پہلے سے ہونا چاہیئے اور اس تعلق کی بناء پر پڑھنے والوں کے دلوں میں اُردو کی محبت پیدا کرنی چاہئے۔ محبت حُسن سے پیدا ہوتی ہے پڑھنے والے کے دل میں اگر یہ اثر پیدا ہو جائے کہ اُردو ایک حسین زبان ہے تو پڑھنے میں مدد ملے گی۔" پڑھانے والوں کو چاہئے کہ تدریجاً یہ اثر پیدا کریں" دوسرا قدم افہام و تفہیم کا ہوگا کہ یہ اچھی طرح سے جتا دیا جائے کہ قومی یکجہتی کے لئے یہ کام ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کی زبان سیکھیں اور اس کے سرمائیہ ذہن اور جذبات سے واقف ہو جائیں

یہ عمل واضح ہے کہ پڑھانے والے کو اُردو پڑھنے والے کی زبان جاننی چاہئے اور اُس کی محبت و قدر کرنی چاہئے۔ ناقص طور پر ایک صورت انگریزی بھی ہے۔ انگریزی حروف تہجی سے اُردو حروف تہجی اور اُردو سیکھنے والے کی زبان کے حروف تہجی کے درمیان جو کچھ مشابہتیں پائی جاتی ہیں اُن کی مدد سے بھی بہت حد تک مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے انگریزی کا نام اس لئے لیا ہے کہ یہ ہندوستان میں عام زبان ہے ورنہ یہی کام فرانسیسی یا روسی سے بھی لیا جا سکتا ہے یا کسی اور علاقائی زبان سے۔

سب سے پہلے مسئلہ یہ ہے کہ زبانوں کے حروف تہجی کے تعداد میں فرق پایا جاتا ہے اس سے دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اُردو زبان کے حروف تہجی کی تعداد ہندی زبان

کے حروف تہجی کی تعداد سے زیادہ ہے۔ صحیح تلفظ سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم سارے حروف تہجی کو جانیں۔ حروف تہجی سکھانے کے لئے کہیں تو مرکب حروف تہجی کا استعمال کیا جائے اور کہیں علامتوں کے اضافے سے کام لیا جائے۔ جیسے انگریزی میں TH نے تھ کا کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اُردو اور ہندی کے مابین نقطے کام آتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایشیائی زبانوں میں پڑھانے کے طریقے پرانے ڈھنگ کے ہیں۔ اُردو پڑھانے کے لئے ہمیں نئے ڈھنگ سے کام لینا چاہئے۔ اس کے لئے پرانے قاعدے بالکل ترک کردینے ہونگے۔ جدید قاعدوں میں پڑھانے والوں کو اپنے قوتِ ایجاد سے بھی کام لینا چاہئے۔ یوروپینی زبانوں کو پڑھانے کا طریقہ بہت ترقی پذیر ہے۔ بعض ایشیائی زبانیں مثلاً مصری زبان میں نئے ڈھنگ سے تعلیم کا طریقہ رائج ہے۔ پرانا ڈھنگ تجزیاتی ہے اور نیا طریقہ ترکیبی ہے۔ تجزیاتی طریقہ یہ ہے کہ حروف تہجی کو جوڑ کے الفاظ سکھا دئے جاتے ہیں۔ ترکیبی طریقہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی عبارتیں پڑھائی جاتی ہیں اور جب وقت پیش آئے تو تجزیاتی طریقہ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ نئے طریقے کے استعمال سے اُردو زبان بہتر اور آسان طور پر پڑھائی جا سکتی ہے، اس لئے ہمیں اس طریقے کو اچھی طرح سیکھنا چاہئے تاکہ مقصد براری ہو سکے۔

غیر اُردو داں طلبہ کو اُردو پڑھانے کے سلسلے میں ایک مسئلہ اور یہ ہے کہ اردو کے حروف تہجی میں اور اُن کی ترکیب میں نقص پایا جاتا ہے جو کہ سیکھنے کی راہ میں حائل ہے۔ مثلاً غیر اُردو داں طلبہ کے لئے ذ، ز، ض اور ظ اور اسی طرح ث، س، ص کی انفرادیت کو بھی واضح کرنا مشکل امر ہے۔ دوسری زبانوں میں ایک آواز کے لئے ایک حرف کا استعمال ہوتا ہے جس سے زبان سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہمیں اُردو میں ایسی ترمیم کرنی چاہئے، جس سے یہ نقص دور ہو جائے اور اُردو سیکھنے والے طلباء آسانی سے اس زبان کو سیکھ سکیں۔

مالی ذریعہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے ایک فرد چند افراد کو ہی اُردو زبان سکھا سکتا ہے۔ وسیع پیمانہ پر اُردو سکھانے کے لئے لگن رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے انجمن ترقی اردو جیسی انجمنوں کی امداد ضروری ہے حال میں بہار میں اُردو اکاڈمی نے ایک شعبہ قائم کیا ہے تاکہ غیر اُردو داں لوگوں کو

کو اُردو سکھائی جائے۔ لیکن ہر کام کے لئے صرف روپیہ ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے جوش وخروش اور لگن کی ضرورت بہرحال باقی رہ جاتی ہے۔ انجمنوں اور اکاڈمیوں میں شعبے تو قائم ہوتے ہیں لیکن کام نہیں ہوتا۔ اس کی تدارک کی ضرورت ہے۔ حکومت بہار نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے۔ جن گاؤں میں عام طور سے اُردو پڑھنے والے نہیں پائے جاتے وہاں بھی اُردو پڑھانے کے لئے معلم بحال کئے جا رہے ہیں تاکہ لوگوں میں ذوق وشوق پیدا ہو اور وہ اُردو بہ آسانی سیکھ سکیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ اُردو زبان ایک حسین زبان ہے اور اس سے قومی یکجہتی کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے۔ حروف تہجی کے معاملے میں اُردو میں ہندی فارسی اور عربی کے حروف تہجی لئے گئے ہیں اور اس وجہ سے اس میں حسن بیان پیدا ہو گیا ہے۔ اُردو مصنفین میں ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں اور مسلمانوں کی متحدہ تعداد پائی جاتی ہے۔ اس سے قومی یکجہتی پیدا ہوتی ہے۔ اُردو سکھانا ایک طرح کا فرض ہے۔ اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے عشق پیدا کرنا ہوگا۔ اور تب ہی ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں

از پروفیسر عزیز احمد
رانچی یونیورسٹی
ٹاٹا کالج۔ چائی باکسہ۔

شیو پرشاد وششٹ، جاوید وششٹ شعبۂ اردو، دلی کالج، دہلی

میکدہ!

جو دکھ مٹائے وہ ارض حسیں ملے نہ ملے
کہیں دوا لئے مزاج حزیں ملے نہ ملے
قیام کی ہے جگہ میکدہ ٹھہر جاؤ!
پھر اس طرح کی کوئی سرزمیں ملے نہ ملے

ساقی!

ڈاکٹر آمنہ خاتون کے ہمراہ سبھی!
اہل اردو بھی چلے آئے ہیں میخانے میں
نہ سمجھا ساطر حدار ملا ہے ساقی
عشق اردو کی مے ناب ہے پیمانے میں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشا ناگپور یونیورسٹی

گن وان نرسیمیا

فکر و نظر کا حامل و دھوان نرسیمیا
ہیں کتنے سیدھے سادھے انسان نرسیمیا

جو اچھے اچھوں کو بھی ہوتی نہیں میسر
رکھتے ہیں سادگی میں وہ شان نرسیمیا

جو گیان بھارتی کے شایان شان ہیں رہبر
دراصل ہیں وہ اعلیٰ گن وان نرسیمیا

ہم کو بلا کے اپنا مہماں ہمیں بنایا
ہے یہ کشادہ دل کی پہچان نرسیمیا

ہم اردو والے ہر دم رکھیں گے یاد اس کی
جو آپ نے کیا ہے احسان نرسیمیا

اظہار حقیقت

دی. سی. نرسیمیا کو دیکھا ہے جب سے
یہی اک دعا آرہی ہے لبوں پر

ہمارے وطن کی ہر اک جامعہ کو
الٰہی بس ایسا ہی دی سی عطا کر

بظاہر جو ہو مرد معصوم و سادہ
مگر ہو فراست کا گہرا سمندر

جو ہر اپنے کردار کے آئینے میں
سراپا خلوص و محبت کا پیکر

جسے دیکھ کر ہر بشر بول اٹھے
یہ پتلا ہے انسانیت کا سراسر

یونہی جو بصد وسعت دل نوازے
محبت سے دانشوروں کو بلا کر

اظہار تشکر

خوشا ہم سفیرانِ اردو کو کیا کیا
مسرت کے ساماں کئے ہیں مہیا

میں اپنے سبھی ساتھیوں کی طرف سے
ادا کرتا ہوں شکریہ نرسیمیا

نصابی تجاویز (آنرز اور بی۔ اے)

سید ضمیر حسن دہلوی
شعبۂ اردو دلی کالج دہلی

جناب صدر اور معزز حاضرین جلسہ

اردو کے نئے نصاب کی ترتیب کا مسئلہ کافی عرصے سے اردو اساتذہ اور ارباب اختیار کی توجہ کا مستحق رہا ہے۔ سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ جزوی تبدیلیاں جو وقتاً فوقتاً اس میں ہوتی آئی ہیں، اس مسئلہ کا خاطر خواہ حل نہیں قرار دی جا سکتیں۔ تعلیم کے تقاضے اور علم و آگہی کے حصول گزشتہ پچیس تیس برس میں بڑی حد تک ارتقاء کی نئی منزلوں سے گزرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا، بلکہ امکانات اس بات کے ہیں کہ آئندہ تعلیمی تصور نہ صرف گزشتہ بلکہ موجودہ تعلیمی تصور سے بھی مختلف ہوگا۔ ہمارے لئے صرف یہی سوچنا کافی نہیں ہے کہ اردو کا کلاسیکی ادب طلبا و طالبات اردو کو کس طرح پڑھایا جائے بلکہ ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ہم اردو کے طالب علم کے ذہنی افق اور عصری بصارت و بصیرت میں وسعت اور فکر پیدا کریں۔

صاحبو! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انہیں مکمل نہ کہا جائے تو افہام و تفہیم بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی ... میں ہمیں یہ اعتراف کر ہی لینا چاہئے کہ اردو کا خزانہ آج تک ایسے ادب سے ... خالی ہے جسے عصری آگہی کی معرفت کا خزانہ کہا جا سکے۔ چنانچہ اگر ہم اپنے طالب علم کو احساس کمتری اور مجلسی شرمساری سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اردو آنرز کے نصاب میں چند ایسی کتابیں بھی داخل کرنی ہوں گی جو انگریزی زبان میں ہیں۔ اور جن کے موضوع ادب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ بڑے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ایسی کتابوں کی مثالیں دینا ضروری تو نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر یہ تجویز بنیادی طور پر مان لی گئی تو یقیناً اردو اساتذہ میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں گے جو اس راہ میں ہماری پوری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ لیکن اپنی بات کی مزید وضاحت کرنے کے لئے میں ایسی چند مختصر کتابوں کا نام لینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

سائنس۔ ایجادات اور دریافت سے متعلق میری نظر سے ایک مختصر کتاب گذری ہے جو غالباً اورینٹل لونگ مین پبلشرز نے شائع کی ہے اور جس کا عنوان ہے IDEAS THAT MOVE THE WORLD اسی طرح ایک دوسری کتاب تہذیب اور تمدن کے موضوع پر تعاونی کتاب قرار دی جا سکتی ہے اس کتاب کی ضخامت بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت مختصر ہے۔ اس کا عنوان ہے THE STORY OF CIVILISATION اور اس کے مصنف مشہور مصنف C. E. M. JOAD ہیں اسی طرح ۔تنقید۔ فلسفہ نفسیات اور سماجیات پر بھی تعاونی کتب کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔

گذشتہ کئی برس سے اردو ادب کو تاریخی تناظر میں مطالعہ کا رواج بڑی حد تک مقبول عام رہا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگوں نے ادب کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھنے کا جو مطلب سمجھا ہے وہ درست نہیں ہے ان کے نزدیک مراد یہی کتاب بھی ایک باب اس کتاب کے زمانہ تصنیف کے تاریخی مطالعہ پر محیط ہونا چاہیئے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ادب کے طالب علم کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مورخ کی فراہم کردہ معلومات چوں کی توں تسلیم کر لے۔ ادبی تنقید کا منصب مورخ کی غلطیوں کی جانب نشاندہی کرنا بھی ہے تاریخ کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دور میں مورخ پر ادیب کی نسبت زیادہ پابندیاں عائد رہی ہیں اور بسا اوقات وہ حقائق کو ہو بہو نقطۂ نظر سے پیش کرتا رہا ہے۔ اس کے برعکس ادیب ان پابندیوں سے بلند ہو کر اپنی سماجی ذمہ داریوں کو محسوس کیا ہے اور وہ اپنی تخلیقات میں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بھی ہوا ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ محض تاریخی حوالہ جات پیش کر دینے سے ادب کے تاریخی تجربے کا حق ادا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمارے طالب علم میں تاریخی شواہد کی صحت و عدم صحت کے پرکھنے کا بھی شعور ہونا ضروری ہے۔ اسلئے یہ ضروری ہو گا کہ ہم تاریخ کے مطالعہ کو ثانوی آداب سے بھی طلبا کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔ اور اس کے لئے اچھے مورخین کے انتخابات پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دے کر داخل نصاب کریں۔ اس کے علاوہ ہندی اور علاقائی زبانوں کے ادب کی تلخیص اور انتخاب بھی نصاب میں شامل ہونا ضروری ہے۔

مندرا۔: مجھے جو بات آخر میں کہنا چاہیئے تھی وہ میں شروع ہی کہہ گیا ہوں ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ بات

اتنی اہم نہیں ہے کہ ہمارے موجودہ نصاب میں کیا کیا کمزوریاں ہیں جتنی اہم
یہ بات ہے کہ ہمارا آئندہ نصاب کیا ہونا چاہیئے لیکن چونکہ مستقبل کی
طرف قدم بڑھانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ماضی اور حال کا جائزہ
لیں۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اردو آنرز اور ایم۔ اے کے
موجودہ نصاب کا تنقیدی جائزہ لینے کی جسارت کروں۔

قریب قریب ایک نسل پہلے تک ادب کی بنیادی قدروں کا تصور آج
سے بالکل مختلف تھا۔ اس اجمال کی تفصیل بیس، پچیس برس پہلے کی ادبی
تشریحات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمارے بزرگ اساتذۂ ادب کو خالص علم
بدیع اور علم کلام کی روشنی میں پرکھنے کے قائل تھے چنانچہ محاسن شعری کو
ادبی تشریحات میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حالی کے تجویز کردہ اصول
تنقید اور ادب میں مقصدیت یا معنویت کی تلاش ثانوی درجے کی بات
تھی۔ آج ہم ادب کو معنویت پر پرکھنے کے قائل ہیں۔ جامہ سے زیادہ
روح کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ اسی لئے ایسے تمام نقاد جو ادیب اور
شاعر پر مطالعہ سے پہلے ہی اس کی ذات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ کلاسیکی
ادب کے رومانوی دور کی تخلیقات میں بھی مقصدی عناصر تلاش کرنے پر
کوشاں نظر آتے ہیں۔ اور اپنی وضع کردہ دلائل سے بڑی حد تک طلباء
کے لئے الجھنوں کے سامان بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر
موجودہ اساتذہ اردو کی یہ جماعت اس بات پر متفق ہے کہ ادب محض
مقصدی اقدار کی روشنی میں پرکھا جانا چاہیے تو لہٰذا اردو ادب کا ایک
قابل قدر سرمایہ میوزیم کی نذر کرنا ہوگا۔ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہے کہ
اردو ادب ایک زمانے تک بے روح جاگیردارانہ قدروں کے حسین جال
میں مقید رہا ہے، تو یہ بھی ضروری قرار دیا جائیگا کہ اس ادب کا مطالعہ
اپنے دور کے جمالیاتی مطالبوں کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ کام صرف
اسی وقت کیا جا سکتا ہے۔ جب موجودہ استاد علم کلام، علم بدیع اور زبان
کے تمام نکات سے بخوبی واقف ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو قصیدہ، واسوخت
مثنوی۔ انشاء پردازی، داستان گوئی وغیرہ وغیرہ کی قدر و قیمت کلئے طالب علم
کو اندازہ کرانا بڑا مشکل ہوگا۔ اور اس کے بغیر اس کی تعلیمی بنیاد کمزور
رہ جائیگی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے اور شاید میری طرح خود اور لوگ بھی
یہاں تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ کہ اردو کا نیا استاد خارجی شاعری

اور انشاء پردازی کے قدیم شہ پاروں کے ساتھ انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے اس کا تصور .... ہے بلکہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس کے نصاب مرتب کئے ہیں نصاب ۔ ۔ بے توجہی برتی تھی۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمارے زندگی کے موجودہ نظام کے تحت ادب کو خالص مقصدی اقدار پر دیکھنا ضروری ہے تو نصاب سے ایسے حصے حذف کر دینے چاہئیں۔ جنہیں ان قدروں کا عامل نہ خود سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھا سکتا ہے بلکہ ان کی تشریح کرنے میں اعتماد کی کمی کے سبب خود مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ ساتھ امتحان کے پرچوں میں ایسے سوالات بھی نہیں رکھے جا سکتے جن میں محاسن شعری اور انشاء پردازی کے حسن پر تبصرہ کرانا مقصود ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی تجاویز میں باقاعدہ سلسلہ اور ربط برقرار نہ رکھ سکا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں میرا مدعا ظاہر ہو گیا ہے۔ اور اس جلسہ کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ اس سمت میں جو کچھ کیا جانا چاہیئے اس کے لئے مسلسل فکر اور متعدد ضمنی اجلاس کی ضرورت ہے۔ تب ہی یہ ممکن ہوگا کہ ہم بنیادی اعتبار سے اپنے نصاب کو بدلنے میں کامیاب ہوں۔

"موضوع کا انتخاب"

"تحقیق کے مسائل"

ڈاکٹر منظر عباس نقوی۔

تحقیق کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ جس سے پہلے سب ہی کو ہر سال دوچار ہونا پڑتا ہے، موضوع کے انتخاب کا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ادھر تعلیمی سال شروع ہوا اور وہ طلبہ اور طالبات جنہوں نے ایم اے پاس کر لیا ہے۔ ڈپارٹمنٹ کے چکر لگانے لگے۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ بھائی کس موضوع پر کام کرنا چاہتے ہو تو بلا تامل کم و بیش ایک ہی جواب ملتا ہے " جس پر آپ فرمائیں"؟ اب آپ ہی بتائیں استاد محترم

فرمائیں تو کیا فرمائیں۔ شاگردِ عزیز کا یہ حال ہے کہ ان کی نظر میں ایم اے
اور پی ایچ ڈی سب یکساں آگئے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ جس طرح
خدا کے فضل اور استادِ محترم کے کرم سے ایم اے کر لیا ہے۔ اسی طرح اللہ
نے چاہا تو ایک دن پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہو ہی جائے گی۔ بقول میر،
(قدرے تصرف کے ساتھ) ہو رہیں گے کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا —
مطلب یہ نہ کہ پی۔ ایچ۔ ڈی نہ سہی۔ ایم۔ فل میں تو کوئی شک و شبہ
ہی نہیں۔ نہیں کہہ سکتا ایسے موقعوں پر آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے
سچی بات یہ ہے کہ کم از کم میرے لئے تو یہ موقع بے حد پریشان کن ہوتا
ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ عزیزم کو کیا جواب دوں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذہن میں موضوعات نہیں آتے۔ وہ تو
خوب خوب آتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ادھر کسی موضوع کا خیال آیا
ادھر حضرتِ دماغ نے وکلاء کی طرح جرح شروع کر دی، اس موضوع
پر کام ہو کر کہیں چھپا ہے؟ ہوا ہے تو کیا نہیں کہاں ہوا ہے؟ ایسا تو
نہیں کہ آج کل ہی کہیں کام ہو رہا ہو؟ — پھر اس قسم کے سوالات
بھی، مثلاً کیا واقعی یہ تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے؟ مانا بن گیا تو آیا
کام مکمل بھی ہو سکے گا یا نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ ضروری مواد بھی دستیاب
نہ ہو سکے؟ اور سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ صاحب زادے یا صاحب
زادی جو اس وقت میرے سامنے انتہائی مسکین صورت بنائے زانوئے
ادب تہ کئے نہ سہی کرسی پر ٹانگیں سکیڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس موضوع
پر کام کر بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ غرض شاگرد عزیز کے ایک بالکل
سیدھے سادے سے سوال یعنی "کس موضوع پر کام کروں؟" کا جواب دینا
کم از کم میرے لئے تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کم دشوار کام نہیں
ہوتا۔ ایسے حسنِ اتفاق کہیئے یا خوبیٔ قسمت کہ جس وقت آمنہ آپا کا دعوت
نامہ جیسے ہی اسی نے لا کر دیا میں پھر اسی قسم کے کرب میں مبتلا تھا چنانچہ دعوت
نامہ دیکھتے ہی طے کر لیا کہ سیمینار میں ضرور جاؤں گا تاکہ اپنے ساتھیوں سے
اپنا دکھڑا رو کر دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ صاحبانِ نظر کا مجمع ہوگا، کیا عجب ہے
کہ اس مشکل کا کوئی حل ہاتھ آ جائے۔ مجھے تسلیم کہ کام دشوار ہے
لیکن مل جل کر تو پہاڑ بھی اٹھ جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ باہمی صلاح مشورے سے
کوئی حل نکل آئے۔ چنانچہ اسی یقین کے ساتھ اس وقت تبادلۂ خیال کیلئے

حاضر ہوگیا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اصولی طور پر موضوع کا انتخاب اساتذہ سے زیادہ طلبہ کا مسئلہ ہے۔ طلبہ کا مسئلہ اس لئے کہ تحقیقی کام میں کامیابی کا دار و مدار بڑی حد تک طالب علم کی موضوع سے ذاتی دلچسپی پر ہوتا ہے۔ طالب علم کو اسی موضوع سے ذاتی دلچسپی ہو سکتی ہے جس کے بارے میں وہ کافی مطالعہ اور غور و فکر کر چکا ہو۔ لیکن کیا کیا جائے کہ تعلیمی معیار روز بروز گرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر حالتوں میں طالب علم جب تحقیقی کام کے لئے آتا ہے تو وہ تقریباً بالکل خالی الذہن ہوتا ہے۔

مجبوراً استاد کا پسند کیا ہوا کوئی موضوع اس کو مل جاتا ہے اور وہ اس پر کام شروع کر دیتا ہے۔ اس موضوع سے چونکہ اس کو کوئی ذاتی وابستگی نہیں ہوتی اس لئے کچھ ہی دن بعد وہ اکتا یا گھبرا جاتا ہے۔ اور کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طالب علم نے کسی موضوع پر کام شروع کر دیا اور دورانِ تحقیق معلوم ہوا کہ ایک دوسری یونیورسٹی میں اس موضوع پر پہلے ہی کام ہو چکا ہے یا آج کل ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں اس طالب علم کی ساری محنت اکارت ہو جاتی ہے اور پھر کسی نئے موضوع کی تلاش ہوتی ہے۔ ایسی صورت بھی پیش آئی کہ طالب علم نے ایک موضوع پر کام شروع کر دیا لیکن کچھ ہی دن بعد پتا چلا کہ اس موضوع پر مواد بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ آخر اسے خیرباد کہا پڑا۔ میں ایسے کتنے ہی طالب علموں سے واقف ہوں جو اس مصیبت کا شکار ہوئے اور پھر کہیں کے نہ رہے۔

اب جہاں تک پہلی دشواری یعنی طالب علم کی موضوع سے ذاتی دلچسپی نہ ہونے کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اس کا حل اس اجتماع میں تلاش نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ہم ان طریقوں پر غور کر سکتے ہیں جن سے موضوع کے بارے میں طالب علم کے لئے جو تحقیقی کام کرنے کا خواہشمند ہے ایک ابتدائی قسم کا امتحان لازمی کر دیا جائے۔ ہم چاہیں تو غور و فکر کے بعد ایسے سوالات مرتب کر سکتے ہیں جن سے طالب علم کے سابقہ مطالعے، رجحانِ طبع اور صلاحیت کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر: —

(۱) آپ تحقیق کیوں کرنا چاہتے ہیں؟
(۲) آپ کو ادب کی کس صنف سے دلچسپی ہے؟
(۳) اس صنفِ ادب سے متعلق آپ نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟

(۴) اِن کتابوں میں سے جنہوں نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے
اُن پر اجمالی تبصرہ کیجئے۔
(۵) اِس صنفِ ادب یا فنکار کے بارے میں آپ کے ذہن میں کیا کیا سوالات
پیدا ہوتے رہے ہیں؟
(۶) کیا اِس صنف یا مصنف کے بارے میں آپ کسی نئی حقیقت کا
انکشاف کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو وہ کیا ہو سکتی ہے؟
(۷) کیا آپ اُن زبانوں سے بخوبی واقف ہیں جن کی کتابوں کا مطالعہ دورانِ
تحقیق آپ کے لئے ضروری ہوگا؟

غرض اِس قسم کے سوالات پر مشتمل ایک معروضی قسم کا پرچہ تیار کرکے سائیکلو اسٹائل کرایا جا سکتا ہے اور ہم اُسے داخلے کے ٹیسٹ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کوئی نہ کوئی طریقہ طالب علم کے رجحانِ طبع اور صلاحیت سے واقف ہونے کے لئے ضرور وضع کرنا ہوگا تاکہ خود ہمیں متعلقہ طالب علموں کے بارے میں آگے چل کر جس مایوسی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اُس سے امکانی حد تک محفوظ رہ سکیں۔

لیکن بات اِسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک بنیادی سوال جس کا جواب طالب علم کو نہیں بلکہ صرف ہمیں دینا ہے۔ بہر طور باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اپنے شعبوں میں جو تحقیقی کام کرا رہے ہیں۔ کیا اُس کے پیچھے ہمارا کوئی واضح مقصد ہے یا یونہی تحقیق برائے تحقیق ہو رہا ہے۔ اس وقت صورتِ حال بالکل وہی ہے جس کی طرف پروفیسر محمد حسن صاحب نے خطبۂ صدارت میں اشارہ فرمایا تھا یعنی تحقیق کا مقصد محض یہ قرار دے دیا گیا ہے کہ ایسے موضوعات پر کتابیں تیار کر دی جائیں جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے لکھنے والوں کی نظر سے بچ گئی ہیں گویا کوئی مقصد واضح اور متعین نہیں ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ہم اپنا اور طالب علم دونوں کا وقت اور یو۔ جی۔ سی کا روپیہ ضائع کر رہے ہیں۔

یہ ایک مسئلہ ہے، ایک ایسا مسئلہ جس پر ہم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئیے۔ خوش قسمتی سے ہماری انجمن نے ہمیں ایسے مسائل پر غور و فکر کرنے اور اُن کا مناسب حل تلاش کرنے کا یہ نادر موقع فراہم کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس سالانہ اجتماع کی بڑی اہمیت ہے ہمیں اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہئیے۔

جہاں تک تحقیقی کام میں لا مقصدیت کا تعلق ہے۔ غالباً اس کا ہوا

سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے کام کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ اگر تحقیقی کام کو بامعنی اور مفید بنانا ہے تو ہمیں لازمی طور سے اس کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی اور یہ کام باہمی اشتراکِ عمل اور تعاون ہی سے انجام پا سکتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی مندرجہ ذیل خطوط پر کی جا سکتی ہے۔

پہلا قدم۔ تعینِ مقاصد ہم کسی موضوع پر تحقیقی کام کیوں کر رہے ہیں۔ اور اس کام سے ہمارے ادبی سرمائے میں کیا اضافہ متوقع ہے۔ یہ بات اس وقت تک طے نہیں ہو سکتی جب تک ہمیں اپنی ضروریات کا واضح شعور نہ ہو۔ ہمیں غور و فکر اور باہمی تبادلۂ خیال کے بعد طے کرنا ہوگا کہ ہمارے ادب کی تاریخ، تشریح، تفہیم اور تنقید کے لیے کس قسم کے کام کی ضرورت ہے۔

دوسرا قدم۔ ضروریات کے تقدم (PRIORITIES) کا مسئلہ

ضروریات کا علم ہونے کے بعد ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ ان میں سے بلحاظِ اہمیت کون کونسی ضروریات مقدم ہیں۔ اور کونسی مؤخر قرار دی جا سکتی ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہم سب کام ایک ہی بار شروع نہیں کر سکتے۔

تیسرا قدم۔ موضوعات کی فہرست سازی ضروریات کے تقدم کا مسئلہ طے ہو جانے پر موضوعات وضع کیے جائیں۔ یہ بڑا اہم کام ہے اس لئے کہ موضوعات کے تعین میں ان کی اہمیت، افادیت، جدت اور مواد کی فراہمی ان سب باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔ غرض باہمی صلاح مشورے سے ایک مبسوط فہرست ان موضوعات کی مرتب کی جا سکتی ہے جن پر ہم اگلے پانچ سال میں خود تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے طالب علموں سے تحقیقی کام کرانا چاہتے ہیں۔

چوتھا قدم: تقسیمِ کار تحقیقی کام میں تکرار OVER LAPPING اور تصادم سے بچنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے وسائل کو دیکھتے ہوئے یہ بھی طے کر لیں کہ کس شعبہ میں کونسا کام کیا جا سکتا ہے۔ اس تقسیمِ کار میں مقامی اور نزدیکی کتب خانوں کے ذخیروں کو خصوصاً مخطوطات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا تاکہ تحقیقی کام آسانی سے ہو سکے۔

اگر اراکین انجمن اس منصوبہ بندی کے خیال سے متفق ہیں تو

مختلف اداروں کے اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی جائے جو ایک معینہ مدت میں کام مکمل کر کے انجمن کو اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کمیٹی کی رہنمائی کیلئے کچھ اصول بھی مرتب کرنے ہونگے۔ یہ کام اگر آپ منظور فرمائیں تو اسی اجلاس میں کیا جا سکتا ہے۔ اگر تحقیقی کام کی منصوبہ بندی کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا تو یہ یقیناً انجمن کا ایک بڑا کام ہوگا۔ اور اس سے شاید ان مشکلات کا حل نکل آئے جن کا انتخاب موضوع کے وقت ہمیں سب ہی کو سامنا کرنا پڑتا ہے

(۱) تدوین کا کام پی ایچ۔ ڈی۔ کے طالب علموں سے نہ کرایا جائے بلکہ صرف مستقل ملازمت والے ریسرچ اسسٹنٹس سے کرایا جائے اور اس میں متن کے ساتھ کرایا جائے کہ مدون متن اسی ریسرچ اسسٹنٹ کی نگرانی میں شائع ہو جائیگا

(۲) اسلوبیاتی تجزیوں پر زور دیا جائے۔

ریسرچ کے طالب علموں کے لئے مندرجہ ذیل نصابات لازمی کر دیئے جائیں

(۱) لسانیات کا وہ حصہ جس کا تعلق اسلوبیات STYLISTICS سے ہے

(۲) قواعد کا وہ حصہ جس کا تعلق (SYNTAX) سے ہے

(۳) علم عروض و بیان RHETORICS کے وہ قاعدے جن کا تعلق نثری اور شعری تخلیقات سے ہے۔

نئی ادبی تحقیق کے مسائل

ڈاکٹر محمد ہاشم علی
(میسور یونیورسٹی)

اس بات سے آپ سب واقف ہیں کہ دراصل اردو کی تحقیق کی بسم اللہ ہی دکنیات اور تذکروں کے خطی متن کی اشاعت سے ہوئی۔ چونکہ گزشتہ کم و بیش پندرہ سال سے دکنیات کے خارزار سے الجھے رہنے کا مجھے فخر حاصل ہے اس لئے دکنی تحقیق مقالوں کے تعلق سے چند باتیں آپ سے عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تحقیقی مقالوں کی تکمیل کے وقت یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ سیاسی و سماجی پس منظر کی پیش کشی میں ممکنہ حد تک اختصار سے کام لیا جائے۔ اس لئے کہ عموماً مقالوں میں پس منظر بڑا اہم

زور صرف کیا جاتا رہا ہے کہ میدانِ تحقیق میں آتے آتے محقق کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے۔ اور اصل منظر پس منظر کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے

دوسری بات جو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ دکنی منظوم و منثور صوفیانہ تصانیف کی تدوین کرتے ساتھ ساتھ ان کے مضامین اور موضوعات کو بھی پیش کیا جائے۔ اس لئے کہ ابھی ادب کے محقق صوفیانہ تخلیقات کے موضوع کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف زبان پر توجہ دیتے رہے ہیں۔ اور ان محققین نے جو کچھ زبان پر توجہ دی ہے۔ وہ بھی اس قدر سرسری ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی لسانی تجزیہ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک موضوع سمجھ میں نہ آئے لفظ کا استعمال اور جملوں کی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی۔

اگر میں یہ عرض کروں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ دکنی صوفیانہ ادب کی سلسبیل گلبرگہ شریف سے نکل کر بیجاپور اور گولکنڈہ سے ہوتی ہوئی بنگلور سے سترہ میل کے فاصلہ پر واقع تعلقہ کے مستقر ملنگل پر ختم ہوتی ہے۔ جہاں حضرت ٹیپو سلطان شہید کے مرشد اور دکنی کے ممتاز شاعر و نثر نگار حضرت شاہ صدرالدین کی آخری آرام گاہ ہے اور جن کا یہ ارشاد تھا کہ

مطلب سوں اپنے کام ہے دکنی رہو یا فارسی
مکہ دیکھنے سے غرض جس جس کا ہو آرسی

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دکنی صوفیانہ ادب کے اہم مراکز حیدرآباد اور کرناٹک میں رہے ہیں۔ اس لئے میری تجویز ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میسور یونیورسٹی اور بمبئی یونیورسٹی اساتذہ پر مشتمل ایک انٹر یونیورسٹی ریسرچ بورڈ فار دکنی لٹریچر "INTER UNIVERSITY RESEARCH BOARD FOR DECCANI LITERATURE" کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اور اس کی نگرانی اور رہنمائی میں تحقیقی کام کو آگے بڑھایا جائے۔

میں خصوصیت کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی اور میسور یونیورسٹی کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ ان دونوں جامعات میں دکنی ادب کے مخطوطات کا قابل لحاظ ذخیرہ موجود ہے۔ میسور میں اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں دکنی کے بیسیوں مخطوطات ہیں۔

میری دوسری تجویز یہ ہے کہ ہر سال اُردو تحقیق کا ایک "SUMMER SCHOOL" منعقد کیا جائے۔ جس میں چوٹی کے محققین کے علاوہ کسی دوسرے ادب کے کم از کم ایک جدید محقق کو بھی تدریس کے لیے دعوت دی جائے۔

علی گڑھ کانفرنس میں بھی یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ لیکن اب تک اس پر عمل نہ ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے انعقاد میں کم از کم مالی دشواری تو نہیں ہے۔ کیونکہ U.G.C سمر اسکولوں کے مصارف اٹھانے میں فراخ دل ہے۔ ان اسکولوں میں خاص طور پر یہ بتانے کا اہتمام کیا جانا چاہیے کہ مخطوطات کی روش، املا، کاغذ، روشنائی اور جلد بندی وغیرہ سے ان کے عہد کا اندازہ کس طرح لیا جا سکتا ہے۔

میری ایک اور تجویز یہ ہے کہ انجمن اساتذہ کی جانب سے ہر سال ایک تحقیقی رسالہ کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اشاعت کیلئے بھی مالی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ خود ہمارے صدر انجمن ڈاکٹر محمد حسن صاحب یو جی سی کی اس کمیٹی کے روح رواں ہیں۔ جو اُردو کے تحقیقاتی کاموں کو مالی مدد دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

مجھے ایک اور اہم بات آپ سے یہ عرض کرنی ہے کہ تحقیقاتی کاموں کی سب سے زیادہ مقدار چونکہ پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالروں کی دین ہوتی ہے اور یو جی سی کی موجودہ پالیسی کی روشنی میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ طلبا کی خاطر خواہ تعداد اب ریسرچ کی طرف مائل ہو۔ اس لیے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ معیارِ تحقیق کو صرف باذوق طلبا کی حد تک محدود رکھا جائے۔ اس لیے کہ تحقیق میں جب تک ذوقِ تجسس اور طلبِ صادق کا جذبہ نہ ہو ثمر ہائے تحقیق کی دستیابی ممکن نہیں۔

ریسرچ اسکالرس کی بات جہاں کہیں آتی ہے۔ وہاں نگرانِ تحقیق کا مسئلہ بھی در پیش ہوتا ہے۔ اور شاید آپ سب اس سے واقف ہیں کہ نگرانِ تحقیق کی ذاتِ والا تبار کی شان میں بڑے بڑے قصیدے، مرثیے ہجو اور شہر آشوب لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس نازک مسئلہ کے تعلق سے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ بقول ڈاکٹر گیان چند نگرانِ تحقیق صرف آن

موضوعات پر نگران رہے ... پر آنے سے پہلے اور کسی کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کے بعد ان سے ہر طرح ہدایات دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی راہ میں سنگِ گراں بن جانے کی نہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض سینئر اساتذہ ایسے موضوعات پر بھی کام کرنے والوں کو اپنے ساتھ ٹانک لیتے ہیں جن کے موضوعات میں وہ ابھی درک نہیں۔ اس صورتِ حال کا علاج صرف یہ ہے کہ دوسری جامعات کے اساتذہ کو ثانی نگران مقرر کیا جائے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ معیاری تحقیق صرف ایسی صورت میں منظرِ عام پر آسکتی ہے جب کہ محقق لذتِ محنت و مشقت اور دیدہ ریزی سے آشنا اور عالمانہ و فکری امور کی طرف راغب ہو۔

"ایم اے کا نصاب اور تاریخِ زبانِ اردو"

ڈاکٹر عبدالودود

ایم اے میں تاریخِ زبانِ اردو اور تاریخِ ادبِ اردو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی جامع تاریخِ ادبِ اردو کے فقدان کے باوجود تاریخِ ادبِ اردو کا مطالعہ کر ہی لیا جاتا ہے۔ مختلف اصنافِ سخن اور مختلف تحریکات و رجحانات پر تصانیف و مضامین معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخِ زبانِ اردو کا مطالعہ ایک بڑا مسئلہ بن کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ پنجاب میں کوئی لفظ کیسا تھا، دکن میں اس کی شکل کیا ہو گئی۔ عربی و فارسی الفاظ دکن میں کس طرح پڑھے لکھے اور بولے گئے۔ یہ وضاحت دلچسپ ضرور ہے لیکن عمومی صلاحیت کے طلبہ کے لیے قطعاً مفید نہیں ہے۔ جب لسانیات کے سائنٹفک مطالعہ کا رواج عام ہوا تو اردو کے مطالعہ میں بھی علم اللسان کا دخل شروع ہو گیا۔ میں علم اللسان کے اصولوں کی روشنی میں کسی زبان کے ارتقا کی مختلف منزلوں کے مطالعہ کی اہمیت کا منکر نہیں ہوں لیکن یہ کہنا چاہوں گا کہ ایم اے کے ان طلبا کو جو لسانیات سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے اس میں الجھانا ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ اس زاویے سے زبانِ اردو کیا کسی بھی زبان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لیکن اردو جن حالات سے دوچار ہوئی جس طرح وجود میں آئی اور ارتقا پذیر ہوئی اس کا تقاضا ہے کہ اردو کو تاریخی و تہذیبی پس منظر میں بھی دیکھنے کی کوشش کی جائے اور طالب علموں پر اس کی اہمیت واضح

جائے۔ اردو کے آغاز و ارتقاء کا محض لسانی جائزہ کافی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی چند ایسے پہلو ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی جنہیں نظر انداز کیا گیا اور جن پر غور و فکر کے بجائے تقلید پر ہی اکتفا کیا گیا۔

ہماری زبان کے مورخین نے تمام تر توجہ اردو کی جائے پیدائش کا تعین کرنے پر صرف کی۔ کسی نے پنجاب کو اہمیت دی اور کسی نے دکن کو، کسی نے دہلی اور دہلی کے قرب و جوار کو زیادہ اہمیت دی اور کسی نے بہار کو۔ محمد حسین آزاد سے عہد حاضر تک بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان نظریات کے مطالعہ اور جائزے کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ طالب علم کو ان نظریات میں زیادہ الجھانا اور اس سے بحث کرنا کہ اردو کہاں پیدا ہوئی زیادہ سود مند نہیں بلکہ اسے یہ بتانا چاہئے کہ اردو صرف ایک علاقہ میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بہ یک وقت پروان چڑھ رہی تھی پنجابی اور ہریانی کے خطہ میں، گجرات میں۔ گجرات سے ملحق مالوہ، راجستھان اور خاندیش میں، دہلی اور اس کے قرب و جوار میں۔ اودھ کے علاقہ، فیض آباد، لکھنؤ اور ان کے قرب و جوار میں۔ بھوج پوری کے علاقہ مشرقی یوپی اور بہار میں اردو فروغ پذیر ہوتی رہی۔ دکن کے دربار، دہلی اور پھر لکھنؤ کو مرکزی حیثیت ضرور حاصل رہی لیکن ان مراکز سے دور بھی اردو پھیل چکی تھی۔

اردو اور ہندی میں اس قدر قریب کا تعلق ہے کہ اردو کے ذکر کے ساتھ ہندی کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ اردو زبان کی تاریخیں اس ذکر سے تقریباً خالی ہیں۔ ہندی زبان و ادب کے مورخین نے اردو کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لیکن ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندی اور اردو کے تعلق پر بحث کی جائے اور دونوں زبانوں کا منصفانہ تجزیہ کیا جائے۔ ان کا زور قلم اردو کی مخالفت اور اردو کے اہل قلم پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنے پر صرف ہوا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم بھی ان اہل قلم کی تقلید کریں۔ لیکن اس قسم کے خیالات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ہندی کے باہمی رشتے، کشمکش اور تصادم کا جائزہ لئے بغیر تاریخ زبان اردو کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔ ہندی کو اردو پر فوقیت دینے والے اردو کو ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) کہتے ہیں اور اردو کو ایک آزاد و منفرد زبان ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اردو رسم الخط پر بڑے اعتراضات کئے گئے اور اس پر زور دیا گیا کہ اردو کو دیو ناگری رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے۔ تاریخ زبان اردو کے نصاب میں ان متنازع مسائل کو شامل کرنا چاہئے تاکہ وہ جان سکیں کہ اردو ہندی کی شیلی نہیں بلکہ ہندی اردو کی شیلی ہے۔

کھڑی بولی ہندی کی تحریک اٹھارویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی اس سے قبل فورٹ ولیم کالج میں نثر لکھی جا چکی تھی۔ لیکن شاعری برج میں کی جاتی رہی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس عہد تک اردو ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کر چکی تھی۔ ہندی زبان و ادب کی تاریخ میں ایک طرف اودھی اور برج کی تخلیقات کو جگہ دی گئی اور دوسری طرف دکنی کو دکنی ہندی کا نام دے کر اپنا لیا۔ اس طرح ہندی کی عمر کئی سو سال زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ولی سے غالب تک، غالب کے بعد حالی اور ان کے معاصرین اور جدید شاعروں تک کی اردو کو ہندی کی ایک شیلی کہنے پر ہی اصرار کیا گیا۔ خالص ہندوستانی عناصر کی تلاش کرنے والوں نے اس عہد کے ادب کو اس لئے نظر انداز کیا کہ اس پر فارسی کا غلبہ تھا۔ اردو کی مرکزیت جب دکن سے شمال منتقل ہوئی تو نظم اور گیت کی وہ روایت جو دکن میں نظر آتی ہے، جاری نہ رہ سکی۔ شمال کے شاعروں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور پھر مرثیہ کو اپنایا۔ گیت، نظم اور ہندوستانی عناصر سے رشتہ کے منقطع ہونے میں کسی منصوبہ اور کسی ارادہ کا دخل نہ تھا۔ لیکن اردو کے مخالفین نے اسے ایک قسم کی دانستہ کوشش قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فرق دکن کی تہذیب اور شمال کی تہذیب کا فرق ہے۔ لیکن مخالفین اردو بڑی بے باکی سے اسے تعصب و تنفر کا نتیجہ کہہ دیتے ہیں۔

اردو رسم الخط اور غیر ہندوستانی عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے بڑے دانشوروں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ انہیں بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن انہوں نے اپنی تصانیف و مضامین سے دست برداری کا اعلان نہیں کیا اور آج بھی یہ غلط نظریہ لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اردو رسم الخط کے سلسلہ میں بڑی گمراہ کن تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ ہم اس کے معترف ہیں کہ دیوناگری زیادہ سائنٹفک ہے اور اس انداز سے اگر کوئی دیوناگری کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی مخالفت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن علمی انداز سے لکھنے کی فرصت کس کو ہے۔ اشتعال پیدا کرنے اور جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی گئی، غیر علمی و متعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ طلباء کو واقف کرایا جائے کہ اردو رسم الخط کیوں اور کن حالات میں اختیار کیا گیا اور یہ بھی کہ یہ رسم الخط اتنا غیر سائنٹفک بھی نہیں ہے جتنا کہ اسے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ایک زمانہ میں اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں اس قدر [illegible] لکھا کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کی مشہور تصنیف INDOARYAN & HINDI

ہے۔ اس تصنیف کے دوسرے حصہ میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی زیر بحث آئی ہے۔ انہوں نے اردو سرمایۂ الفاظ اردو پر فارسی کے اثرات اور اردو رسم الخط کو تہذیبی پس منظر میں نہیں بلکہ مذہبی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دکن والوں نے فارسی رسم الخط صرف اس لئے اختیار کیا کہ ان کی زبان انہیں کے ہاتھوں میں رہے۔ چٹرجی اہل دکن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں — "انہوں نے اپنے ساتھ شمال سے لائی ہوئی ہندوستانی کو پکڑے رہنے کا عہد کیا کیوں کہ اس کے ذریعہ وہ دلی اور مسلم اقتدار اور تہذیب کے دوسرے ہندوستانی مراکز سے اپنا تعلق قائم رکھ سکتے تھے۔ وہ اپنی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھتے تھے تا کہ اس کی باگ ڈور یا ارتقا مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہے"۔ ان کا خیال ہے کہ شمال سے آئے ہوئے مسلمانوں کو ڈر تھا کہ اگر انہوں نے اپنی ہندوستانی کو چھوڑ دیا تو زیادہ تعداد والے مرہٹوں، تلنگوں اور کنڑوں میں ضم ہو جائیں گے۔ ایسے نقطۂ نظر پر تبصرہ کیا جائے۔ صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا اور یقیناً ہی آپ بھی میرے [illegible] کہ اس زمانہ میں لسانی مسئلہ نام کی کوئی شئے نہ تھی اور نہ آج کی طرح مذہب کا رشتہ زبان سے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ کون نہیں [illegible] دکنیوں نے فارسی رسم الخط اس وجہ سے نہیں اپنایا کہ ان کی زبان اور رسم الخط دوسرے نہ سیکھ سکیں بلکہ انہوں نے یہ رسم الخط اس لئے اختیار کیا کہ وہ پہلے ہی سے اس سے واقف تھے۔ معلوم نہیں۔ شمالی ہندوستان کے ان صوفی شعراء کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ جنہوں نے اودھی کو فارسی رسم الخط میں لکھا نہ کہ دیوناگری میں۔ ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے والوں کو ان کے نظریہ سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ "ہندوؤں کی زبان ہندی کو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی خواہش اور جھکاؤ کے مطابق مسلمانی شکل دے دی گئی" تو اس کا جواب دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ خاموش رہنا اردو اور اردو تہذیب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

آج تک ایسی منطق کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔

فارسی و عربی الفاظ صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی [illegible] سندھ میں عرب زیادہ عرصہ تک رہے لیکن سندھ کے لوگوں نے عربی رسم الخط اختیار کیا۔ پنجابی۔ گجراتی۔ مراٹھی اور مختلف بولیوں میں عربی

فارسی الفاظ اس قدر ہیں کہ ان کے بغیر زبان اپاہج ہو کر رہ جائے گی۔ اس قسم کی گل افشانیاں، چندر بلی پانڈے، دھیریندر ورما، اور دوسرے زبان کے بنواری وغیرہ نے بھی کی ہیں۔ اردو کے طالب علم کو اردو کے خلاف کیے گئے پروپیگنڈے سے واقف کرانا اور اس کی حقیقت و اصلیت کا مدلل جائزہ لینے کی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ گمراہ کن معروضات کا شعوری اثر قبول کرنے سے نئی نسل محفوظ رہ سکے۔

ھندی تحریک کو تاریخ زبان اردو کا جز ہونا چاہیے۔ تاکہ اردو کا طالب علم اس تحریک کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو سکے کیوں کہ یہ تحریک قدم قدم پر اردو سے ٹکراتی ہے "ہندو کی ھندی اور مسلمانوں کی اردو" کی تقسیم کرنے والے اور ھندی کی قدامت کا دعوی کرنے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ ۱۹ویں صدی کے آخری برسوں میں کھڑی بولی ھندی اور برج کے حامیوں میں کس قدر زوردار مباحثے ہوئے۔ کھڑی بولی ہندی میں شاعری کی مخالفت بڑے ہی مدلل انداز میں کی گئی۔ مخالفین کا نظریہ تاریخی و لسانی حقائق پر مبنی تھا۔ کھڑی بولی ہندی میں تجربے ہوئے انہیں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ آج ان تجربات کو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے لوگ ان سے مطمئن نہ تھے۔ ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ کھڑی بولی پر برج کو فوقیت دی جائے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ اردو کے سامنے ہندی کا چراغ روشن نہ ہو سکے گا۔ ہماری زبان کے محققین نے تحقیق و جستجو ایک محدود دائرے میں کی جو کچھ فارسی رسم الخط میں ملا اسے اردو کہا اور دیوناگری رسم الخط کو نظر انداز کیا۔ دیوناگری میں بہت سی ایسی تحریریں نظر آتی ہیں جن پر اردو کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

یہ بات اور ہے کہ ایسی تحریروں میں کہیں کہیں الفاظ کا تلفظ مجروح ہوا ہے لیکن اس سے یہ تو ثابت ہی ہوتا ہے۔ اردو سرمایۂ الفاظ اور اردو طرز کو مقبولیت حاصل تھی۔ زبان داں اور غیر زبان داں، معیاری اور غیر معیاری کی تفریق نے اردو پر ضرب کاری لگائی۔ شرفائے شہر ہی زبان کے مالک بن بیٹھے۔ ایک ہی شہر کے محلوں اور طبقوں میں زبان کے معیار کی تفریق کی گئی اور فصیح و غیر فصیح کی دیوار حائل کر دی گئی۔ اس غلطی کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے اور تاریخ زبان اردو میں اس جز کا اضافہ کرنا چاہیے، جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھا — بقیہ ص

اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل ۔ کشمیر میں

مرزا محمد زمان آزردہ : لیکچرر پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو ۔
کشمیر یونیورسٹی

روزگار کا مسئلہ آج پوری دنیا کے لئے ایک خوفناک دیو اُن کے کھڑا ہو گیا ہے ۔ یہ کسی خاص ملک یا ریاست کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ اور نہ ہی اس کی مختلف وجوہات سے بحث کرنے کا یہ موقع ہے ۔ ہمارا ملک ہندوستان بھی اور ممالک کی طرح اس مسئلے سے دوچار ہے ۔ اس مسئلے نے آج ایک خوفناک شکل اسلئے بھی اختیار کی ہے کہ اب عام لوگ تقدیر کی پرستش چھوڑ کر تدبیر کے بندے ہو گئے ہیں ۔ اُن کی نظروں کا مرکز اب تدبیر ہے علوم کی ترقی نے انہیں تقدیر کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے ۔۔ وہ کام کرنا چاہتے ہیں اپنی طاقت اور بساط سے زیادہ کام کرنے کے خواہاں ہیں چنانچہ اس بات کے پیش نظر انسان تعلیم حاصل کرتے وقت بھی اپنے مستقبل کی فکر میں رہتا ہے ۔ پہلے زمانے میں تعلیم ذہن و روح کی تربیت کے لئے حاصل کی جاتی تھی مگر اب سب سے پہلے جسم کی پرورش کو مد نظر رکھا جاتا ہے اسلئے مواقع روزگار کو سامنے رکھ کر ہی تعلیمی میدان میں کوئی آگے بڑھتا ہے ۔ موجودہ زمانے میں تعلیم کا سب سے بڑا مقصد اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ فرد مکمل زندگی کے لئے تیار ہو جائے سماج میں ایسی جگہ پیدا کرے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت محسوس ہو ۔ اسلئے تعلیم دیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ طالب علم جیسے زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب رہ سکے گا یا نہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں علوم کی تعلیم ، منطق ، تاریخ اور فلسفہ جیسے علوم کی طرف اب کم ہی توجہ کرتے ہیں ۔ زبانوں میں سنسکرت ، عربی ، یونانی ، عبرانی وغیرہ سے بھی لوگ آہستہ آہستہ اپنا دامن کھینچ رہے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی علم یا زبان کی بازار میں قیمت کم ہے تو لوگ خود بخود کنارہ کشی اختیار کرتے جاتے ہیں ۔ ملک بھر میں اردو کا بھی یہی حال ہوگا اگر وقت پر اس کی طرف توجہ نہ کی جائے ۔ اس بات کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ وہی لوگ آج اردو سے دامن بچاتے پھرتے ہیں جن کے بزرگوں نے اس کو خون سے سینچا اس کی چمن بندی کی اور اتنا مہکایا کہ سارے عالم میں اس کی خوشبو پھیل گئی ۔ دوسرے گلستانوں کی بلبلیں اس باغ میں اپنے آشیانے بنانے لگیں تھیں ۔ باغ اب بھی وہی ہے البتہ ان باغبانوں کی ضرورت ہے جو نئے انداز میں اس کی چمن بندی کریں ۔ اس کے گلوں کو ایک تازہ خوشبو سے مہکا دیں ، تاکہ مستقبل میں یہ مہک آنے والوں کے ذہنوں کو تر و تازہ رکھے ۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ۔۔۔ [illegible]

بہت سے نوجوانوں کو اپنا آلۂ کار بنالیا ہے لیکن یہاں صورت حال اتنی نہیں بگڑی ہے کہ اس سے انسان مایوس ہو۔ یوں تو ایمرجنسی Emergency کے نفاذ سے ملک میں دور دور تک روزگار کے وسائل کو توسیع دی جارہی ہے۔ اب بڑے بڑے کارخانہ دار من مانی نہیں کرسکتے۔ انجینیرنگ گریجویٹس اور ڈپلوما ہولڈرس کو اب کارخانوں میں Apprenticeship کے لئے برابر جگہ مل رہی ہے۔ اس سے ملک کے نوجوانوں کی صلاحیتوں سے ہرممکن فائدہ اٹھایا جائے گا۔ کشمیر اس معاملے میں پچھڑا ہوا علاقہ ہے۔ رفتہ رفتہ ٹیکنیکی کارخانوں کی طرف یہاں کے حکام کی توجہ بھی مبذول ہو رہی ہے۔ موجودہ وزیراعلیٰ جناب شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو اس بات کا شدید احساس ہے۔ چنانچہ آن کے حکومت سنبھالتے ہی ایسے کئی اعلانات ہوچکے ہیں۔ ادھر ٹیکنیکی تربیت کے لئے طلباء اور طالبات کا انتخاب اس انداز سے ہو رہا ہے کہ بہترین صلاحیتوں والے نوجوان کافی آگے بڑھنے کے امکانات دیکھ رہے ہیں۔ اردو کی تعلیم پانے والوں کے لئے بھی یہاں روزگار کے مواقع کافی ہیں۔ اور ان کا مستقبل ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں زیادہ روشن ہے۔

یہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ۱۹۰۸ء کے قریب ڈوگرہ مہاراجوں نے بعض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اب بھی جبکہ اردو کے مولد سے بھی اس زبان کو تقریباً دیس نکالا مل چکا ہے، اس ریاست کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اردو اس کی سرکاری زبان ہے۔ محکمۂ پولیس، محکمۂ مال اور عدلیہ اپنا سارا کاروبار اسی زبان میں چلاتے ہیں۔ یہ تین محکمے روزگار مہیا کرنے کی کافی گنجائش رکھتے ہیں۔ اب تک تو خیر پرانے زمانے سے کم تعلیم یافتہ لوگ بھی تینوں محکموں میں بھرتی ہوتے رہے ہیں لیکن ریاست کا تعلیمی معیار چونکہ اب بڑھ چکا ہے اسلئے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ عرائض نویسوں، وکلاء اور ججوں کے علاوہ ان محکموں کے نقل نویسوں اور منشیوں وغیرہ کا بھی اردو تعلیم یافتہ ہونا ضروری تصور کیا جانا چاہئے۔ جسطرح نائب تحصیلداروں اور تحصیلداروں کے ریاستی پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں کامیاب ہونے کے علاوہ اردو سے واقف ہونا ضروری ہے، چنانچہ اس مقصد سے انہیں اردو کی تعلیم دی بھی جاتی ہے، اسی طرح اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے، ایسے پیشوں کے لئے ضروری تعلیم دے کر ان محکموں میں مزید گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر محکمۂ پولیس کے آفیسروں کے لئے جہاں نوجوانی بہت ضروری خیال کی جاتی ہے وہاں آن کے لئے اردو کی تعلیم بھی ویسی ہی اہم ہے۔ راقم کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تک جو پولیس آفیسر یہاں کام کرتے آئے ہیں وہ اردو سے نابلد ہیں، مگر اردو میں سند یافتہ لوگوں کی تعداد ان میں بہت کم ہے۔ اگر زبان کے معاملے میں اس محکمے کے اہل کار زیادہ قابل ہوں تو کام اور بھی اچھا ہوگا۔ اب تک کام چلاؤ جذبے کے تحت ہی ان باتوں کو پرکھا جاتا ہے

اسی طرح اردو لکھے پڑھے نوجوانوں کو تربیت دے کر عرائض نویسی کا کام سکھایا جاسکتا ہے جس میں روزگار کی کافی گنجائش ہے۔ یہ حیرانگی کی بات ہے کہ ہماری عدالتوں میں عرائض نویسوں

میں نوجوانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اکثر پنشن یافتہ لوگ ہی بحالت مجبوری اس پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن میں بھی محکمۂ مال سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنی پرانی اور پختہ عادتوں کی وجہ سے اس پیشے میں کوئی جدت بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی عمر کا وہ حصہ اس پیشے میں صرف کرتے ہیں جس میں سیکھنے کی قوت بہت کم باقی رہتی ہوتی ہے۔ اسلئے ایک دن اس اچھے خاصے اور ضروری کام سے نوجوان بالکل نابلد ہوں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عرائض نویسی کی تربیت کے لئے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں نوجوان اس سے مستفید ہوں۔ اب بھی محکمہ اس کے لئے ایک امتحان ضرور لیتا ہے مگر اس میں زبان کی صحت اور انفرادی صلاحیت کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کم از کم اُن لوگوں کو پاس نہیں ہونا چاہئے تھا جو بہت ہی کم وقت کے بعد دنیا کو ہی چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ خود تو خیر اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں لیکن اپنی غلطیاں اس پیشے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ جان کر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہاں عدالتوں میں وکیل تو آسانی سے مل جاتے ہیں مگر عرائض نویس کے پیچھے کافی وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ یہاں عرائض نویس کی آمدنی بھی ایک عام وکیل سے زیادہ ہوتی ہے۔

پٹواری سے لیکر گرداور، تحصیلدار اور کمشنر تک کا اردو تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں بھی مواقع روزگار کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اردو میں سند یافتہ نوجوان بمقابل دوسروں کے ان پیشوں میں زیادہ کامیاب رہ سکتے ہیں۔

آبادی کی مناسبت سے یہاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اردو پروگراموں کو ملک کے دوسرے حصوں سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ لوگ ریڈیو (اردو پروگرام) زیادہ سنتے ہیں۔ لیکن لکھنے والوں کی کمی ہے۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اردو میں سند یافتہ نوجوانوں کو اس قسم کی تکنیکی تربیت نہیں دی جاتی۔ کشمیر یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد حسن نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے اس بات کی پرزور سفارش کی تھی کہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈیو اور ٹی وی کے لئے سکرپٹ رائٹنگ (Script Writing) کا ایک ڈپلوما کورس شروع کیا جائے۔ اس سے روزگار کے وسائل اور وسیع ہو جاتے لیکن کسی وجہ سے اس پر ابھی تک عمل نہیں کیا جا سکا۔ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا جائے تو اس سے دو اہم فائدے ہونگے ایک تو یہ کہ اردو تعلیم یافتہ نوجوان ریڈیو اور ٹی وی کے لئے لکھ کر بے کاری کے خوف سے نجات پا سکتے ہیں اور دوسرا یہ کہ ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کی جانے والی چیزوں کا معیار بڑھ جائیگا۔ اس وقت جو لوگ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے لکھتے ہیں ان میں سے اکثر تو پیشہ ور لکھنے والے نہیں ہیں۔ اور اُن میں بھی زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو عمر کی اس حد تک پہنچ گئے ہیں جہاں تخلیقی صلاحیتیں ظاہر کرنے کے لئے انسان کے پاس بہت کم قوت رہی ہوتی ہے۔ پھر نوجوانوں میں بہت کم تعداد (نہ ہونے کے برابر) اب تک سامنے آئی ہے۔ اس کام کو کئی مختلف شعبوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۱۔ نشری ڈرامہ نگاری ۲۔ سکرپٹ

رائٹنگ ۳۔ مکالمہ نگاری ۴۔ افسانہ نگاری ۵۔ منظر نگاری اور منظر کشی ۶۔ تقریر نگاری وغیرہ۔ اس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نوجوان اپنی منفرد صلاحیتوں کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع پا سکتے ہیں۔ ان کے روزگار کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو جائیگا اور ایسی تعلیمی ایجنسیوں (ریڈیو اور ٹی وی) کا معیار بڑھ جائے گا۔ اس کے علاوہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہوگا۔

یہاں ۹۰٪ سے زیادہ اخبار اردو میں چھپتے ہیں اور اس کا چرچا اتنا ہے کہ اکثر دکانداروں کو فرصت کے وقت میں اردو کا اخبار ہاتھ میں لئے نظر آئیں گے۔ ہر ریستوران میں آپ کو اردو اخبار رکھے نظر آئیں گے۔ لوگوں کی اس پسند اور علمی رجحان سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اب تک یہاں اخباری دنیا پر ان پڑھ صحافیوں کا راج ہے۔ ان پڑھ اس لحاظ سے کہ یہاں کے صحافی اردو زبان میں باضابطہ سند یافتہ نہیں اور زبان سے پورے طور پر واقف نہیں۔ اردو زبان کے لحاظ سے دو ہی روزنامے قابل ذکر ہیں وہ ہیں 'آئینہ' اور 'آفتاب'۔ دوسروں میں کچھ بات پیشہ ور صحافی ہیں جن کو صرف ضرورت نے سامنے لایا ہے۔ انہیں صحافت تو آتی ہے مگر اردو نہیں آتی۔ ہمارے نوجوان جو اردو زبان و ادب میں سند یافتہ ہیں اردو تو جانتے ہیں مگر صحافت نہیں۔ پیشہ ور صحافی جن کا ذکر آچکا ہے، اس میدان میں اتنا کام کر چکے ہیں کہ اب خود سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اردو کے نوجوان طالب علموں کو اس پیشے کی طرف راغب کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے بھی ایک تربیتی کورس کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ... حسن سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے ایک یہ تجویز بھی یو جی سی (U G C) کو پیش کی تھی لیکن ابھی تک اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اس سے بھی اردو میں سند یافتہ اکثر نوجوان فکر روزگار سے آزاد ہوتے۔ کالم نویسی، رپورٹنگ، ایڈیٹنگ وغیرہ کا کام کر کے ان کی صلاحیتیں بہتر کارآمد ہو سکتی ہیں۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ ایک طرف نوجوان اس پیشے سے صرف تربیت نہ ملنے کی وجہ سے گھبراتے ہیں اور دوسری طرف یہاں کے صحافی اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کچھ لوگ اس میدان میں آجائیں جو ان کے بعد اس علم کو بلند رکھیں۔

یہاں کے اکثر تجارتی اشتہارات اردو میں چھپتے ہیں لیکن ان کا اندازہ فوراً ہی ہو جاتا ہے کہ زبان و بیان کے لحاظ سے اشتہار نگار میں تو مدد دیتا ہے لیکن شہرت نہیں ہو پاتی اور تاجر کا مقصد پورا نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ کچھ رقم بجائے محکمۂ انکم ٹیکس کے اخباروں کو چلی جاتی ہے۔ اگر نوجوانوں کو اشتہار نویسی کی تربیت دی جائے تو یہ بھی ان کے لئے ایک وسیلۂ روزگار بن سکتا ہے۔ صرف شہر سرینگر میں سات سینما ہاؤس ہیں جہاں اوسطاً ہر ہفتے آٹھ فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔ ان کے اشتہارات بھی اردو میں چھپتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ہر سینما ہاؤس میں کم از کم ایک ہول ٹائم اشتہار نویس کی ضرورت ہے جو مقامی رنگ میں اشتہار

کوشش کی کہ ان کے کاروبار کو اور زیادہ کامیاب بنا سکتا ہے۔ اگر اس وقت ایسا نہیں ہوتا تو اس کی سب سے بڑی وجہ راقم کی نظر میں یہ ہے کہ ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوتی۔ اگر اردو کے اساتذہ اور طالب علم ان کی اس ضرورت کا احساس انہیں دلائیں تو کچھ جگہیں یہاں بھی نکل سکتی ہیں۔ یہی حال دیواری اشتہاروں کا بھی ہے۔ اگر مسافر بسوں کی اندرونی دیواروں پر پینٹ کئے ہوئے اشعار اور اشتہار دیکھے جائیں تو ایسے اشتہار نویسوں کی ضرورت کا احساس اور شدید ہوگا۔ اس ضمن میں دعوت ناموں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان باتوں کو زیر نظر رکھ کر اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار کے وسائل تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

خوشنویسی کی ایک کلاس تو پہلے ہی یہاں کی کلچرل اکادمی، جس کے صدر ریاست کے وزیر اعلیٰ ہیں، شروع کر چکی ہے۔ جس کا کام اب تک حوصلہ افزا رہا ہے۔ یوں تو کاتبوں کا مسئلہ سارے ملک میں ایک ہیبت ناک شکل اختیار کر چکا ہے۔ اچھے کاتبوں کی کمی نے ناشروں اور مصنفوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اگر پڑھے لکھے لوگ اس پیشے کی طرف راغب ہوں تو ادب کو ایک نئی زندگی ملے گی۔ یہاں تو کاتبوں کی کمی نے اخبار والوں تک کو پریشان کر دیا ہے۔ اکثر ایک ہی کاتب کئی کئی اخباروں میں کام کرتا ہے کبھی کبھی تو محض کاتب کی علالت یا آرام طلبی کی وجہ سے بھی اخبار شائع نہیں ہوتا۔ اس ضرورت کو بروئے کار لا کر اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار کا ایک وسیلہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کے اکثر تاجر انگریزی میں حساب و کتاب رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر محکمۂ انکم ٹیکس کی کشمیر رینج میں ایسے ملازم بھی رکھے جائیں جو اردو سے واقف ہوں تو اردو سند یافتہ امیدواروں کے لئے ایک اور دروازہ وا ہوگا۔ اسی طرح محکمۂ [illegible] پبلسٹی، محکمۂ اطلاعات اور گورنمنٹ پریس کا بھی حال ہے۔ وہاں بھی اردو میں سند یافتہ نوجوانوں کو بھرتی کیا جا سکتا ہے مگر ایسے محکموں میں اردو جاننے کو ثانوی قابلیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے جبکہ اسے پرائمری قابلیت تصور کیا جانا چاہئے۔

اردو ٹائپ رائٹنگ کی ایک کلاس پہلے ہی یہاں شروع کی جا چکی ہے۔ اس میں مہارت حاصل کرنے والوں کے لئے بھی روزگار کے مواقع کافی ہیں۔ اکثر جگہیں کاتبوں کا انتظار نہیں کرتیں۔ پھر عدالتوں، محکمۂ مال، محکمۂ اطلاعات وغیرہ کے دفتری کاموں میں ایسے ماہرین کی اور بھی ضرورت رہتی ہے۔

یہاں کے سکولوں اور کالجوں میں طلباء اور طالبات کی اکثریت اردو کی تعلیم لے رہی ہے۔ آٹھویں درجے تک تو وادی بھر میں ۹۵٪ سے زیادہ طالب علم اردو کو اپنا رہے ہیں اور ان کا ذریعۂ تعلیم دوسرے مضامین کے لئے بھی اردو ہے۔ اسی لئے یہاں کے سرکاری، غیر سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں میں اردو میں سند یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار کے وسائل کافی ہیں۔ اسی طرح کالجوں میں بھی کافی تعداد میں طلبا اردو پڑھتے ہیں، یہاں اردو پڑھنے والوں کے لئے روزگار کے وسیلے کافی ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ اصل سکولوں میں اردو کی تعلیم کو کوئی حا

بھی دی جاتی مگر ایسے اداروں کی تعداد اول تو بہت کم ہے اور دوسرے اس کو سرے سے ہی نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس کی تعلیم کا اپنی طرف سے خاطر خواہ بندوبست کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو پڑھانے والے اساتذہ کی تربیت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ بی ای سی اور بی ایڈ کی تربیت کے دوران اکثر اساتذہ تدریس اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے اساتذہ اکثر کتابوں کے لئے پریشان رہتے ہیں مگر تدریس انگریزی و تدریس ہندی پر لکھی گئی کتابوں کی مدد سے وہ اپنی اس ذمہ داری کو نبھاتے ہیں۔

اس بات کو پیش نظر رکھ کر درسی کتابوں کا مسئلہ بھی اردو کے سند یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار مہیا کرنے کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔ ریاست کی موجودہ حکومت تعلیمی نظام کے سدھار کی طرف پوری توجہ دے رہی ہے۔ جس نظام کو حکومت کا ایک فضول شعبہ سمجھا جاتا تھا وہی اب حکومت کی خاص توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ یہ ہر رنگ میں حوصلہ افزا ہے اور ہر ذی شعور اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک خاص قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ ریاست نے درسی کتب کی تیاری اور فراہمی کے لئے ایک بورڈ کو اختیارات دئے ہیں۔ اس طرح کاروباری نقطۂ نظر سے درسی کتابیں تیار کرنے والے ناشروں کی حوصلہ شکنی ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ بورڈ کے چیرمین ڈاکٹر آغا اشرف علی سند یافتہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرکے اپنے بالغ نظر پروفیسر ہونے کا ثبوت دیں گے اور مستقبل قریب میں ہی ایسے لوگوں کے نام درسی کتابوں پر نظر نہیں آئیں گے جن کا ہمیشہ نام ہی سنا ہے بلکہ جن کے بارے میں یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ یا تو مر کھپ گئے ہیں یا کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اور وہ ایسے ہر فن مولا بنائے گئے ہیں کہ اردو کی گرامر ہو یا انگریزی کا ترجمہ، ریاضی کی سچائیوں کی کتاب ہو یا تاریخ کی کتاب، انگریزی مضامین کی کتاب ہو یا اردو مضامین کی۔ ان کا نام سرورق پر نمایاں طور پر شائع ہوتا ہے اور کتاب کے اندرونی صفحات پر کسی مجبور پڑھے لکھے غریب کا خون۔ جس کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

ہو بسمل کا مقتل کی زمین پر نہ خنجر پر نہ ان کی آستیں پر

اس اندھیر میں آج تک تعلیم یافتہ لوگوں کا جس قدر استحصال ہوا ہے، شاید اور کسی طرح نہیں ہوا ہوگا۔

اگر سنجیدگی سے درسی کتب کو ترتیب دیا جائے تو انگریزی اور اردو جاننے والوں کے لئے روزگار کی کافی گنجائش ہے۔ بلکہ اردو والوں کے لئے زیادہ۔ اسلئے کہ آٹھویں جماعت تک تعلیم پانے والوں کی تعداد بہرحال ہمیشہ زیادہ ہوگی جن میں ۹۵٪ سے زیادہ طلبا کا وادی میں ذریعۂ تعلیم بھی اردو ہی ہے۔ لہٰذا اردو کی درسی کتابوں کی ترتیب کے علاوہ اردو میں دوسرے مضامین پر تیار کی گئی کتابوں کی زبان کی صحت کے لئے بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہوگی جو اردو میں سند یافتہ ہوں۔ اب تک دیکھا گیا ہے کہ اکثر تدریجی حیثیت سے کتابیں تیار نہیں کی جاتیں۔ چھٹے درجے کی کتابوں کی زبان بعض اوقات ساتویں درجے کی

کتابوں سے نسبتاً مشکل ہوتی ہے۔ اگر میٹرک کی اردو کتاب اور پی یو سی کی اردو کتاب کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات فوراً ہی سمجھ میں آتی ہے کہ مصنف دسویں جماعت کے طالب علموں سے گیارہویں جماعت کے طالب علموں کی بنسبت کچھ زیادہ توقعات رکھتا ہے۔ خود دسویں جماعت کی ہی اردو کتاب دیکھ لیجئے۔ یہ کتاب طلباء نویں اور دسویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ اس کا وہ حصہ جو ہمارے بچے نویں جماعت میں پڑھتے ہیں اس حصے سے مشکل ہے جو دسویں میں پڑھنا ہوتا ہے۔ اس کی درجہ بندی اس انداز کی ہونا چاہئے تھی کہ طالب علم اور استاد دونوں بڑی آسانی سے اس کام کو نپٹا سکتے۔ پھر ہر کتاب کے لئے ایک ٹیکسٹ بک گائڈ کا ہونا ضروری ہے جو استاد کے لئے ہو تاکہ اسے معلوم ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کس انداز میں پڑھنا ہے۔ ہر مضمون کے تدریسی تقاضے اپنے ہوتے ہیں جس طرح ہر نظم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کتاب میں مشق کے لئے کچھ ایسے اہم سوالات بھی دئے جائیں جن سے طلباء اور اساتذہ اپنے کئے ہوئے کام کی پڑتال کرکے اطمینان حاصل کریں۔ اساتذہ کے لئے (Graded EXERCISE BOOKS) کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اس طرح کی کتابیں تیار کرنے کے لئے اردو میں سند یافتہ نوجوانوں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوتعلیم یافتہ آسانی سے اس ذمہ داری کے کام کو نبھا نہیں سکتے مگر چار چار پانچ پانچ آدمیوں کا ایک گروہ کسی ایکسپرٹ کے ساتھ کام کرکے تربیت بھی حاصل کر سکتا ہے اور کام بھی انجام دے سکتا ہے۔ جہاں تک دوسرے مضامین کی اسی کتابوں کا تعلق ہے جو تدریسی مقصد کے پیش نظر اردو میں چھپتی ہیں۔ ان کے بارے میں استاد اور ٹیکسٹ بک دونوں کو بعض لوگ بری کرتے ہیں کہ وہاں تعلیم زبان مقصد نہیں بلکہ صرف تدریسی مواد پر نظر ہونا چاہئے لیکن ایسی کتابوں کی زبان کی غلطیوں سے ہمارے بچوں کی زبان کی عادتوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ اسلئے کہ طالب علم کے سامنے سب سے مستند چیز درسی کتاب ہی ہوتی ہے۔ بعض اساتذہ بھی درسی کتاب کو ایک ذریعہ (Tool) کی بجائے مقصد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی کتابوں کی زبان کی صحت کا کام بھی ایسے ہی لوگوں کو سونپا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہاں اردو تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے روزگار کے وسائل کو اور وسعت دی جا سکتی ہے۔

نچلے درجے کے صنعتی تربیتی ادارے Industrial Training Institutes۔ جہاں اکثر صنعتوں (Trades) میں آٹھویں جماعت پاس لوگوں کو داخلہ ملتا ہے، بھی اس مصیبت کے شکار ہیں۔ اردو میں تدریسی کتب مثلاً آئیل انجن گائڈ، گیس انجن گائڈ، ایکسپائک گائڈ، لانڈری گائڈ وغیرہ وافر تعداد میں فراہم نہ ہونے کی وجہ سے تربیت پانے والوں پر انگریزی کا بوجھ ڈالتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے ٹریڈ میں آسانی سے مہارت حاصل نہیں کرتے۔ اس ضرورت کو بھی درسی کتب کی تیاری اور اساتذہ کی بھرتی کے سلسلے میں بروئے کار لاکر ایک اور وسیلے کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

کشمیر اپنے مناظر قدرت کی وجہ سے دنیا بھر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ یہاں کے

مناظر کو فلموں میں اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ دور دور سے فلم ساز آ کر یہاں کے دلفریب مناظر فلماتے ہیں۔ اگر کشمیر میں ایک فلم انسٹیٹیوٹ قائم کیا جائے تو روزگار کا ایک اور وسیلہ سامنے آئے گا۔ مختلف دستاویزی فلمیں تیار کر کے نوجوان اردو تعلیم یافتہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بات تو ہر ایک تسلیم کرے گا کہ اگرچہ آج کل اکثر فلموں پر زبان کے معاملے میں ہندی کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے پھر بھی فلم انڈسٹری کا اردو سے اتنا گہرا رشتہ ہے کہ دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

غرض اردو کی تعلیم کے ساتھ ملک کے دوسرے حصوں میں جو روزگار سے متعلق خطرات لاحق نظر آتے ہیں وہ یہاں کسی حد تک مفقود ہیں۔ بلکہ راقم یہاں کے حالات سے بہت حد تک مطمئن ہے۔ ان ذرائع کو اور بھی وسعت دی جا سکتی ہے مگر ان سب باتوں کے لئے شرط اول یہ ہے کہ اردو کے اساتذہ اپنے شاگردوں کو زبان و ادب کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ کام کرنا بھی سکھائیں۔ ایک بھرپور اور مکمل زندگی کو ہر شعبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اساتذہ ان کو کچھ مفید کام کرنا سکھائیں تو ان کی زندگی ادھوری نہیں رہے گی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اردو کی تعلیم سے لوگ اپنے بچوں کو اسلئے باز رکھیں کہ اس میں روزگار کے وسائل محدود ہیں۔

(رپورٹ کا بقیہ مضمون صفحہ سے آگے)

کر نہیں ہے۔ اساتذہ اور ان کے متعلقین کی امداد کے لئے ہم نے لکھنؤ کانفرنس میں جو ریلیف فنڈ بڑے جوش و خروش سے قائم کیا تھا اب تک اس میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں ہو سکا ہے۔ مالی دقتوں کی بنا پر ہی خبرنامہ بھی پابندی سے شائع نہیں ہو پا رہا ہے جس کے ایک شمارے کی اشاعت پر تقریباً ڈھائی سو روپیہ کا صرف ہوتا ہے۔ امید ہے کہ اس صورت حال پر اس اجلاس کے شرکا سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

آخر میں مجھے اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر محترم ڈاکٹر ایچ۔ نراسمہیا کنوینر ڈاکٹر آمنہ خاتون اور دوسرے اراکین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے بہت کم وقت میں کانفرنس کی تیاری کی۔ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ ان کے کاموں میں ہم بہت کم مدد کر سکے اس لئے جو بھی کوتاہیاں رہی ہوں اس کا ذمہ دار مندوبین حضرات مجلس استقبالیہ کے بجائے ہمیں قرار دیں۔

(ڈاکٹر) قمر رئیس

شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

۲۰ اکتوبر ۷۵ء

اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل

نجم الہدیٰ: شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفرپور

تعلیم کی اغراض مختلف ہوتی ہیں، لیکن شائستگی اور روشنی کے حصول کے علاوہ بالعموم دو ہی طرح کے مقاصد کسبِ علم سے وابستہ ہوتے ہیں: ذوق کی تکمیل اور معاش کا تنگ بند و فراہم کرنا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیشتر آخرالذکر مقصد ہی حصولِ تعلیم کا محرک ہوتا ہے۔

تعلیم کی غرض و غایت سے قطع نظر اس کی مختلف انواع میں بنیادی طور پر دو قسمیں ہوتی ہیں، عمومی تعلیم اور اختصاصی تعلیم۔ علم میں اختصاص بھی کبھی ذوق کی بنا پر نشو و نما پاتا ہے اور کبھی فکرِ معیشت کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔

بلاشبہ بڑھتی ہوئی آبادی، سمٹتی ہوئی دنیا، مادیات پر انسان کا بڑھتا ہوا تصرف، کائنات کی تسخیر کی جانب نوعِ بشر کا اقدام، روز بروز پیچیدہ تر ہوتا ہوا نظامِ حیات، مفادات کا تصادم اور اغراض کی پرستش ——— ان سب نے مل کر موجودہ دنیا بالخصوص ہمارے ملک کے لئے جہاں وسائل کو بروئے کار لانے کے مقابلے میں بڑھتی ہوئی آبادی کا تناسب کچھ زیادہ ہی ہے، معاش کے مسائل کو سنگین اور غور طلب بنا دیا ہے۔ معاش کے مسئلے کا تعلیم سے جو تعلق ہے اور جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا، وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ معاش کے مسئلے کو تعلیم و تدریس کی سطح پر بھی حل کیا جائے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے ماہرین بھی روزگار پر مبنی تعلیم (یعنی Job-oriented education) جیسی چیزوں پر غور کرنے یا عمل پیرا ہونے پر مجبور ہیں۔ اسی لئے تا حال بہت سے تعلیمی شاخسانے پیدا کئے ہیں اور جب تک فکرِ معاش کی طرف سے کامل اطمینان نصیب نہیں ہو جاتا نئے نئے تعلیمی شعبے اور پہلو نکلتے اور نکالے جاتے رہیں گے۔

ان دنوں ہمارے ملک میں معیشت افروز یا روزگار پر مبنی تعلیم (Employment oriented education) کی بات زیادہ کی جانے لگی ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عمومی تعلیم کے بجائے تکنیکی تعلیم یا ایسی تعلیم دی جائے جو بنیادی طور پر موجودہ اقتصادی ڈھانچے سے مطابقت رکھنے کی بنا پر روزگار کے حصول کا براہِ راست ذریعہ بن جائے۔ اس کے لئے نصابِ تعلیم کو بھی نئے سانچے میں ڈھالنے کی باتیں کی جاتی رہی ہیں۔ کاروباری ضرورتوں، نئی دنیا کے کام کاج کی نئی چیزوں اور روز مرہ کے ان مسائل سے

جو معیشت کے سلسلے میں درپیش ہیں، تعلیم کا تعلق ظاہر و باہر ہے۔ روزگار پر مبنی تعلیم اس تعلق کا مظہر ہوگی اور اس سے جو علمی شعبے وابستہ ہوں گے، وہ اس قسم کے ہوں گے جیسے بزنس منیجمنٹ، کامرس، زراعت، مختلف قسم کی دیہی صنعتیں، صحافت، بین الاقوامی ترجمانی یا بین السانی ترجمہ اور ایسے علوم و ہنر، دورِ حاضر میں جن کی ضرورت ملک و قوم کو درپیش ہے، مثلاً فنِ تعمیر میں مہارت، مختلف اقسام کی مشینی، تعمیری، تکنیکی اور کیمیائی ہنرمندی، ناٹومی اور میڈیکل سائنس، آڈٹ اور احتساب، شارٹ ہینڈ وغیرہ۔

ایسی تعلیم میں زبانوں کا جو کردار ہے، وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ زبان کو تکنیکی تعلیم کا صرف میڈیم سمجھنا مناسب نہیں ہوگا؛ ہم اب تک اپنی زبان کے میڈیم سے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی اہمیت پر توجہ نہیں دے سکے ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل سائنسی یا تکنیکی معلومات، چاہے جس میڈیم سے ہو، حاصل کرلے، حالانکہ ایسی تعلیم جو تعلیم حاصل کرنے والوں کی اپنی زبان میں ہوگی، ان کی اقتصادی غایت کے واسطے سے ان کا مقصود و مدعا بن کر اور ان کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ ہو کر (کیونکہ ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جسے زبان کے بولنے والوں کا مزاج کہہ لیجئے) ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر جائے گی اور یہ تعلیم جیسی ٹھوس اور پائدار ہوسکتی ہے، اس کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔

بحث طلب صرف یہ ہے کہ اس طرح کی تعلیم میں زبانوں کا جو کردار ہے، اس کے دو پہلو ہیں، نصابی اور لسانی۔ نصابی پہلو یہ ہے کہ روزگار پر مبنی تعلیم پانے والوں کا نصاب ان کی اپنی زبان کے میڈیم سے (میں اردو والوں میں ہوں تو کہوں گا کہ اردو کے میڈیم سے) کچھ ایسے سانچوں میں ڈھالا جائے جو عصری تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوئے معیشت کے مواقع فراہم کرے اور لسانی پہلو یہ ہے کہ ایسی تعلیمات میں میڈیم کے فرائض انجام دینے والی زبان کی وسعت، محدودیت اور امکانات کا لسانی جائزہ علوم و فنون سے ہم آہنگ کر دینے کے اعتبار سے لیا جائے۔ پہلے آخرالذکر (لسانی) پہلو پر ہی توجہ ڈالی جائے۔

تکنیکی تعلیم کے لئے زبانوں کا اس قدر ترقی یافتہ ہونا ضروری ہے کہ اس میں مخصوص اصطلاحوں کی گنجائش اور تمام علمی باتوں کو سمیٹنے کی استعداد ہو۔ جہاں تک ہماری اردو کا تعلق ہے آج بھی اصطلاحوں کے مسئلے پر اتفاقِ رائے اور اطمینانِ کامل نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ اصطلاح سازی کا کام بڑے پیمانے پر جامعۂ عثمانیہ میں ہو چکا ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ اور موجودہ ترقی اردو بورڈ دہلی کی کوششیں بھی غالباً اس سمت میں ہو رہی ہیں۔ مختلف طبعی اور عمرانی علوم سے متعلق اردو میں کتابیں لکھی اور چھاپی جا چکی ہیں اور اس طرف پھر تالیف و ترجمہ کی شکل میں ایسا رجحان نظر آتا ہے۔ ان کتابوں کی افادیت پر بھی ہمیں غور کرنا ہوگا اور انہیں زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لئے کوششیں کرنی ہوں گی۔ ان کتابوں میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں کے مسئلے پر بھی از سرِ نو غور و خوض کرنے کی ضرورت اگر محسوس ہو تو اس کے لئے

یا تو اصطلاح سازی کے نئے ادارے قائم کئے جائیں یا جو پہلے سے ہیں، ان کی کوششوں کے نتائج کو معیاری اور مستند قرار دینے کی سبیل نکالی جائے۔ تاکہ اصطلاحوں کے استعمال میں پایا جانے والا فرق مٹ جائے اور معیاری اصطلاحوں کو رواج عام حاصل ہو۔

بحث کے اس پہلو کا اصل مسئلہ اردو ذریعۂ تعلیم سے تکنیکی مہارت حاصل کرنے والوں کے مستقبل کا ہے۔ مستقبل کے تحفظ کا یقین ہوئے بغیر اردو والے یا تو انگریزی کا سہارا لیتے ہیں یا جب انگریزی کو چھوڑتے ہیں تو لامحالہ دوسری ہندوستانی زبانوں کا دامن پکڑتے ہیں۔ اس طرح بات زبان کے مستقبل، اس کے ماحول اور اس کے فروغ کے امکانات تک جا پہنچتی ہے۔ شکر ہے کہ نئی زمانہ اردو کے لئے دلوں میں جو نرم گوشہ اور جو سازگار بیرونی ماحول پایا جاتا ہے، وہ پچھلے اٹھائیس برسوں میں نہیں تھا۔ اس ماحول سے مستفید ہونے کے لئے عملی اقدام اور عملی سہولتیں حاصل کرنے کی کوششیں لابدی ہیں۔

تکنیکی علوم کے علاوہ جن عمومی علوم و فنون کا رواج پہلے ہی بکثرت ہے مثلاً علم طبیعات و کیمیا، علم نباتات و حیوانات، علم طبقات الارض و جغرافیہ، علم تاریخ و بشریات، عمرانیات و نفسیات، وغیرہ ان کی تعلیم میں بھی علاقائی اور ثانوی سرکاری زبانوں کا جو دخل ہو سکتا ہے، اس کے نقطۂ نظر سے ہمیں اردو کی حیثیت پر غور کرنا ہے۔ اور اس کو اگر جامعۂ عثمانیہ کے سابق کارناموں اور ترقی اردو بورڈ کی جاری رہنے والی کوششوں کے باوجود ہم اسے اس قابل نہیں سمجھتے تو اس قابل بنانا ہے کہ وہ قومی ترقی، معیشت اور بہبود کے کاموں میں اپنا رول ادا کر سکے۔ پھر بھی کوئی ضروری نہیں کہ اردو کے ذریعہ تعلیم پانے والا تکنیکی یا فنی مہارت بھی بہم پہنچائے۔ بالکل عمومی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے بھی اور ان کے لئے بھی جو مذکورہ علوم و فنون میں اختصاص پیدا کرتے ہیں، اردو کو کم از کم دہلی، یو.پی.، بہار، اور آندھرا پردیش میں ثانوی زبان کا درجہ دلانے سے بات بنی ہے۔ اور اردو ذریعۂ تعلیم سے عمومی قسم کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو بھی معاش کی سہولتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسی کے لئے اردو یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم سے فارغ ہونے والے تکنیکی ماہرین و متخصصین کی روزگار میں کھپت کی ضمانت چاہئے اور ساتھ ساتھ اردو کی عمومی تعلیم حاصل کرنے والوں کو دفتروں اور کاروباری اور حکومتی اداروں میں دوسری ہندوستانی زبانوں میں برابر کی دستگاہ رکھنے والوں کے برابر معاشی سہولتیں دی جائیں۔

جہاں تک روزگار پر مبنی اردو تعلیم کے نصابی پہلو کا تعلق ہے، اردو کے اساتذہ کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ وہ اردو میں مروجہ اور دستیاب نصابوں اور کتابوں کے علاوہ عصری ضرورتوں کے مطابق ایسے علمی شعبوں کو اردو کی نصابی تعلیم میں روشناس کرنے کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں جو دوسری زبانوں میں موجود ہیں یا اردو میں ہیں بھی تو محدود طور پر

اور بہت کم یونیورسٹیوں میں متعارف ہیں، مثلاً نوٹنگ، ڈرافٹنگ کا فن، صحافت، مختلف زبانوں سے (اردو میں) ترجمہ، وغیرہ۔ ان میں سے بعض کو اردو کی اعلیٰ تعلیم کے شعبوں اور شاخوں کے طور پر غالباً دلی یونیورسٹی کے سوا اور کہیں ہم نہیں دیکھتے۔ ان شعبوں کو وسعت بخشنے اور مختلف یونیورسٹیوں میں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اردو شارٹ ہینڈ ہندوستان میں کلیتہً نامانوس ہے اور یہ اس وقت تک رواج پذیر نہیں ہو سکتا جب تک دفتر کے کاروبار میں اردو کا استعمال نہیں ہوتا۔ پھر بھی اردو کی یونیورسٹی سطح کی تعلیم [illegible] یونیورسٹی مراسلت کے لیے اگر وسیع پیمانے پر دفتر قائم کیے جائیں تو اردو کا استعمال کیا جا سکتا ہے اور اردو ٹائپ رائٹنگ کے ساتھ اردو شارٹ ہینڈ کے علم کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اردو میں سستے ٹائپ رائٹروں کو فراہم کرنے اور ان سے کام لینے کی ابھی ضرورت ہے۔ غرض کہ پہلے میدانِ عمل اور جولانگاہ فراہم کیجئے، پھر نصاب بنائیے یا علوم کا سنگ بنیاد ڈالئے۔ اردو تعلیم کو اگر روزگار کے مسائل کے لئے مفید بنانا ہے تو ماحول کے موجودہ مصادر اور دائروں کو وسیع کرنا ہوگا اور اپنے نصاب میں بھی وسعت اور لچک پیدا کرنی ہوگی۔ اس کے لئے اردو والوں ہی جو اہلِ علم ہیں، خواہ وہ اردو کے استاد نہیں بھی ہوں، انھیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور اردو کا جدید تکنیکی نصاب تیار کرنے اور معیشت آفریں اردو تعلیم کے ڈھانچے کا جائزہ لینے میں اپنی فنی مہارت اور علمی اختصاص کے ساتھ بھرپور عملی تعاون کرنا ہوگا۔

اردو ٹائپ رائٹروں کی بات نکلی ہے تو اردو رسم خط کی مخصوص انفرادیت پر غور کرتے ہوئے اس سلسلے میں فن کتابت کے فروغ کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خوش نویسی اور خطاطی کے ادارے قائم کرنے اور ان فنون میں کمال حاصل کرنے والوں کے معاشی مسئلے کا مستقل حل ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ اگر فن کتابت پر ہی اردو اکیڈمیاں، انجمن ترقی اردو اور اس طرح کے ادارے توجہ کریں تو اردو تعلیم کے رسم خط سے فنی تعلق رکھنے والوں کے بھی روزگار کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

میں قصداً خالص شعر و ادب کو معرضِ بحث میں لانا نہیں چاہتا کیونکہ جب ہم روزگار کے مسائل پر مبنی تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ ہم تخلیقی ادب، زندگی سے ادبی مسائل کے تعلق اور ذوقِ جمال وغیرہ کو معیشت کے تابع کر دینا چاہتے تھے۔ ہمارا یہ جائزہ اردو کے تعلیمی رخ کا جائزہ ہے، نہ کہ ادبی رخ کا اور اسی لئے اس پہلو ہی پر زور دیا گیا ہے کہ علمی اختصاص میں محرک کے طور پر کبھی صرف ذوق کارفرما ہوتا ہے اور کبھی معاش کا مسئلہ بھی دخیل ہو جاتا ہے۔ عمومی تعلیم اگر ذوق کے تحت ہو تو وہ ادھوری تعلیم ہے اور برائے معاش ہو تو اس کا جائزہ انھیں سطروں میں لیا جا چکا ہے۔ شعر و ادب کی تعلیم اور اس میں دستگاہ اور اختصاص کو اس طرح روزگار سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا جس طرح زبان و ادب کے دوسرے اور معیار کے اعتبار سے ثانوی شعبوں اور

شافتوں کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے، ویسے ہم جس دنیا میں سانس لیتے ہیں، اس کا نظام معیشت ہی کچھ ایسا ہے کہ اقتصادیات سے خالص تخلیقی عوامل کا بھی ربط بہ آسانی ڈھونڈ نکالا جاسکتا ہے اور موضوع کا تقاضہ یہ ہے کہ گفتگو کے اس رخ کو میں ہاتھ نہ لگاؤں۔

اردو روزگار کے مسائل - کرناٹک میں

قاضی محمد انیس الحق، لیکچرر، آچاریہ پاٹ شالا کالج - بنگلور *

۱۹۵۶ء میں ہندوستانی ریاستوں کی تشکیل لسانی بنیادوں پر کی گئی تو ریاست کرناٹک کی زبان کنڑی قرار پائی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے وقت کرناٹک کی کل آبادی کا ۵٫۸ فیصد حصہ یعنی ۲۰ لاکھ چوبیس ہزار افراد نے اپنی مادری زبان اردو لکھائی اور ۲۲٫۲ فیصد آبادی نے اس کو اپنی دوسری جاننے والی زبان کا درجہ دیا۔ یعنی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے بموجب جملہ ۳۳٫۳ فیصد آبادی نے اردو زبان سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔ ۱۹۷۱ء میں ۳۱ لاکھ کرناٹکیوں نے اپنی مادری زبان اردو لکھائی جو اس ریاست کی ۱۱ فیصد آبادی ہے۔

قدیم ریاست میسور کے کل ۹ اضلاع تھے اور ان اضلاع میں زمانہ قدیم سے اردو تعلیم کا باقاعدہ بندوبست تھا، جس کسی بھی گاؤں میں بیس پچیس اردو بولنے والے خاندان ہوتے تو حکومت کی طرف سے ایک اردو مدرسہ کا بندوبست ہوجاتا تھا۔ نئی ریاست کی تشکیل کے بعد چار اضلاع حیدرآباد سے تین بمبئی سے دو مدراس سے اور ایک کورگ کو کرناٹک میں ضم کردیا گیا۔ حیدرآباد سے آئے حصوں کے سوا باقی اضلاع میں اردو پڑھائی کا بندوبست نہیں تھا۔ نئی ریاست کی تشکیل کے بعد گو حکومت کی طرف سے اردو کو کوئی نقصان نہیں پہنچا مگر ریاست میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے حکومت نے بہت

سے غیر سرکاری اداروں کو سکول اور کالج چلانے کی اجازت دی جس کی وجہ سے غیر سرکاری سکول اور کالجوں میں دن بدن اضافہ ہونے لگا ان میں ذریعۂ تعلیم انگریزی یا کنڑا تھا۔ ان اداروں نے کوتاہ بینی سے کام لے کر اپنے سکولوں اور کالجوں میں اردو کو جگہ نہیں دی اور مجبوراً اردو بچوں کو ہندی ثانوی زبان کی حیثیت سے لینا پڑا اور ایک نسل اردو سے ناآشنا ہونے لگی ۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ جو عیسائی ادارے ۱۹۶۰ء سے پہلے اردو پڑھائی کا انتظام کرتے تھے انھوں نے اپنے سکولوں سے اردو کو بے دخل کر دیا۔ جس کی وجہ سے اردو غیر سرکاری مدرسوں کی امر ہون منت ہو گئی اور ان سرکاری مدرسوں کا معیار اتنا گرنے لگا کہ ماں باپ اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے غیر سرکاری مدرسوں کی طرف رجوع ہونے لگے جہاں ایک تو ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور وہاں اردو پڑھائی کا کوئی بندوبست نہیں ہے ۔ ریاست کے اردو دانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے اپنی جانب سے اعلیٰ اور معیاری غیر سرکاری سکول بھی نہیں کھولے ۔ سوائے ضلع بیجا پور میں جناب مرزا مغل کی کوششوں سے چند اردو مدرسے اس ضلع میں کامیابی سے چل رہے ہیں اور ہائی سکول تک ان سکولس میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے ۔ شہر بنگلور سے ایک تحریک مسلمانوں کی تعلیم کے لئے شروع کی گئی ، اتفاق سے اس کی بسم اللہ ہی غلط شروع ہو گئی۔ اور الامین ایجوکیشنل سوسائٹی کا سے شروع ہونے والے پرائمری مدرسوں میں کنڑی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت بھی نہیں دی گئی ۔

پرائمری سطح پر اردو کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے اردو اساتذہ کو سوائے سرکاری سکولوں کے اور کوئی جگہ نہیں مل رہی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اردو اساتذہ بے روزگار ہو گئے ہیں اور ان کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے ۔

اسکے برعکس ریاست کرناٹک کے چالیس فیصد ہائی سکولس میں اردو کو پہلی زبان کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے ۔ مگر تعلیم یافتہ اساتذہ کی کمی کی وجہ سے کئی سرکاری اور غیر سرکاری ہائی سکولوں میں اردو اساتذہ کی گنجائش ہونے کے باوجود اساتذہ کا بندوبست نہیں ہو سکا ہے ۔ اور ان سکولوں میں طلبا بغیر استاد کے اردو کا امتحان دیدیتے ہیں ۔

جہاں تک سرکاری کالجوں کا مسئلہ ہے وہاں پر اردو اساتذہ کا برابر تقرر ہو رہا ہے ۔ مگر سب اردو طلبا کو سرکاری کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا ۔ اس لئے وہ غیر سرکاری کالجوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔ چند ایک غیر سرکاری کالجوں کو چھوڑ کر باقی کالجوں میں اردو اساتذہ کا بندوبست نہیں ہے اسکے دو وجوہ ہیں ۔

(۱) یونیورسٹی اور پری یونیورسٹی بورڈ کی اجازت

(۲) سرکاری امداد کے لئے شرط ۔

ہماری یونیورسٹیوں نے غیر سرکاری کالج کے طلبا کو جن کی زبان اقلیتی ہوتی ہے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ اقلیتی زبان کے طلبا بغیر استاد اور حاضری کے زبان کا امتحان دے سکتے ہیں۔ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر سرکاری ادارے اردو لیکچرر کا تقرر نہیں کراتے۔ اگر کسی غیر سرکاری کالج میں اردو لیکچرر کا تقرر ہوتا ہے تو بھی وہ مستقل نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ڈائرکٹر آف کالجیٹ ایجوکیشن کی طرف سے گرانٹس کے لئے چند شرائط ہیں۔ ان میں ایک شرط یہ ہے کہ کسی بھی اقلیتی زبان کے شعبہ کے لئے ہر کلاس میں پانچ طلبا کا ہونا لازمی ہے۔ اگر کسی سال کسی بھی وجہ سے یہ تعداد گھٹ گئی تو اردو لیکچرر کے سر پر برخواستگی کی تلوار پڑ جانا یقینی ہے۔ اس لئے غیر سرکاری کالجوں کے اردو اساتذہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔

اگر ہماری یونیورسٹیوں کے ذمہ دار غیر سرکاری کالجوں کے منتظمین کو شعبہ اردو کھولنے پر اصرار کریں یا اردو طلبا کے لئے اردو اساتذہ کے تقرر کو لازمی قرار دیں تو کئی کالجوں میں اردو اساتذہ کا تقرر ہو سکتا ہے۔

اور اگر حکومت غیر سرکاری کالجوں کو امداد دیتے وقت اقلیتی زبانوں کے لئے غیر مشروط امداد دیں تو جن جن کالجوں میں اردو اساتذہ موجود ہیں وہ بھی محفوظ ہو جائیں گے اور دوسری کالجوں میں جگہ نکل آئیگی۔ اقلیتی زبان کے شعبہ کی تعداد یکساں رہنا ناممکن ہے اس لئے کہ روزانہ بدلتے ہوئے تعلیمی انتظام میں سب سے پہلے اقلیت ہی شہید ہوتی ہے۔

اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل

اے۔ محمد ابراہیم

جناب صدر، عزیز حاضرین

اردو کے تعلیمی نصاب اور اردو کے سند یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے مسائل پر مختلف کانفرنسوں اور دیگر ادبی نشستوں میں اس قدر کہا گیا ہے کہ ان باتوں کو ازسر نو یہاں دہرانا، تحصیل حاصل کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ لہٰذا میں اس مختصر گفتگو میں "اردو ایم۔ اے کے نصاب کو" روزگار کے موجودہ مسائل کے پیش نظر معنی خیز بنانے پر چند ایک تجاویز پیش کرونگا جو اردو کے ارباب اقتدار کی توجہ کی طالب ہیں۔ جیسا کہ اردو کے مشہور ادیب اور نقاد، ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنے ایک مضمون میں فرمایا ہے، "درس و تدریس دراصل ایک مسئلہ نہیں جس پر براہ راست گفتگو کی جا سکے' یہ کئی اہم مسائل ہیں جو ایک کلمہ دان کے دایرے میں آگئے ہیں جن میں کس طرح پڑھایں اور کیا پڑھایں سب سے زیادہ اہم ہے۔" مجھے محترمی ڈاکٹر شارب ردولوی کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے۔ لیکن میری اس گفتگو کا موضوع ہے "اردو ایم۔ اے کی جماعتوں میں کیا پڑھایں اور کس لئے پڑھایں۔" مگر اس سے قبل میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ نصاب اور روزگار کے مسایل صرف اردو ایم۔ اے کی تعلیم تک محدود نہیں بلکہ انجینرنگ، میڈیسن اور سائنس کے شعبے بھی ان کی زد میں آچکے ہیں۔ افراط زر اور کساد بازاری کی طرح بے روزگاری بھی، اقوام عالم کے لئے ایک خطرناک مسئلہ بن چکی ہے اور خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں یہ مسئلہ نہایت شدت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ گذشتہ پندرہ بیس برسوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد میں ہر سال جو اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے سند یافتہ نوجوانوں کے لئے آج کل روزگار فراہم ہونا ایک معجزے سے کم نہیں اور آئندہ برسوں میں اس مسئلہ کی شدت میں مزید اضافہ ہونا یقینی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی علمی اور فنی صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نہ صرف روزگار پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکیں بلکہ ملک کے اچھے شہری بھی بن سکیں

ڈاکٹر محمد حسن (صدر انجمن اساتذہ اردو - دہلی)

خطبۂ صدارت

رفیقو اور دوستو!

اس اعزاز کا شکر گزار ہوں جو آپ نے اس کانفرنس کی صدارت سے سرفراز فرما کر عطا کیا ہے۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے اور آپ کی کرم گستری کا بھی اور یہ احساس اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے جب اس اجلاس کی اہمیت پر نظر جاتی ہے۔ ہم دو سال بعد یہاں مل رہے ہیں۔ پچھلے سال ہمیں ناگزیر حالات کی بنا پر مظفرپور کی مجوزہ کانفرنس منسوخ کرنی پڑی۔ ان دو برسوں میں زمانے نے کئی اہم کروٹیں لی ہیں اور ان کی آگہی اور شعور ہم مدرسوں کے لیے بھی لازم ہے۔

میں اس موقع پر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی طرف سے ان تمام مندوبین اور مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہوں جو ہماری دعوت پر ملک کے کونے کونے سے دور دراز کی مسافت طے کر کے بنگلور آئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بنگلور کے ساتھیوں اور مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جن کی ان تھک محنت اور بے پناہ خلوص نے یہ موقع فراہم کیا کہ اردو کی تعلیمی برادری ایک بار پھر نئے حالات میں تعلیم و تدریس کے مسائل کا جائزہ لے سکے۔

ہماری بدقسمتی بھی ہے اور سعادت بھی کہ ہم دوسرے اساتذہ کی طرح محض کسی زبان یا ادب یا علم کے مدرس ہی نہیں بلکہ اپنی زبان و ادب کے مجاہد بھی ہیں اور محافظ بھی ہیں۔ ہماری زبان اور ہمارا ادب پچھلے ۲۸ سال سے مجرمانہ غفلت اور تعصب کا شکار نہ ہوتا تو یقیناً ہمارا کام بھی درس گاہ کے اندر شروع ہونا اور وہیں ختم ہو جاتا۔ مگر ہمیں یہ سعادت ملی ہے کہ ہم جس زبان و ادب کو اپنے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی صدیوں کی کمائی جانتے ہیں، اس کے تحفظ ہی نہیں اس کی توسیع کے لیے اپنی درس گاہوں ہی میں نہیں اپنے محلے اور شہر بھی اپنے دیوان خانے اور بازار میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان کوشاں ہوں۔ اس لحاظ سے ہر استاد گویا اردو ہی کا سفیر نہیں۔ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کا سفیر ہے اور اس لحاظ سے اس کی ذمہ داری اپنے ہم پیشہ استادوں سے کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اسی لیے جب کبھی اردو کے استاد جمع ہوتے ہیں، اردو کے مستقبل کا سوال سب سے پہلے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ کیا یہ سریلی اور شیریں زبان جس کا رسیلا پن صدیوں سے دلوں کو موہتا آیا ہے۔ ذہنوں کی تنگ نظری اور تجارتی غفلت کا شکار ہو جائے گی۔ اور صرف مشاعروں کی واہ واہ اور قوالیوں کی دھوم دھڑکے میں گم ہو کر رہ جائے گی۔ جب اردو کی حمایت میں کوئی نیا قدم اٹھتا ہے۔ اردو دنیا کی ہر آنکھوں میں چمک آتی ہے اور اکثر نظر مایوس لوٹتی ہے پچھلے ۲ سال گجرال کمیٹی کی سفارشات کے انتظار میں گزر گئے اور انتظار بھی ایسا کہ نالۂ یعقوب اور صبر ایوب کو شرمائے لیکن کمیٹی کی سفارشات دفتروں کی بھول بھلیاں میں آج بھی بدستور گم ہیں۔ پھر سفارشات آخر سفارشات ہیں جنہیں ارباب انتظام ان میں سے کتنی باتیں منظور کریں اور کتنی محض فائل میں دفن ہو جائیں مگر ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان سفارشات میں کام کی باتیں کتنی ہیں اور وہ کس حد تک اردو دنیا کے ذہنی ضروں کو پورا کرتی ہیں

اردو ابھی تک دلوں پر حکمرانی سے دستبردار نہیں ہوئی ہے لیکن دل کی یہ آواز دماغ تک کب پہنچے گی اور ایوان کب اس آواز کو سن سکے گا۔ اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ اردو والوں کا مطالبہ سیدھا سادا ہے۔ اردو کو دوسری علاقائی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔ اردو والے خواہ کسی علاقے کے ہوں اپنے علاقے کی علاقائی زبان سیکھنے کو تیار ہیں۔ ہندی کو قبول کرنے اور اس زبان میں مناسب مہارت کا درجہ حاصل کرنے پر آمادہ ہیں۔ وہ مانگتے ہیں تو صرف اتنا کہ ان کو اردو سیکھنے کی سہولت ملے اور ان کی زبان کو ثانوی زبان تسلیم کر لیا جائے تاکہ اردو والے اپنے کو دوسرے درجے کا شہری محسوس نہ کریں۔ اور ملک کے جمہوری نظام میں برابر کے حق دار ہو سکیں۔ معلم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ملک میں آزاد خیالی رواداری، بے تعصبی اور سماجی انصاف کی قدریں محفوظ رکھیں۔ اور اس مبارک فضا کو قائم رکھنے کے لیے ہم نہ صرف آزاد شہری کی حیثیت سے بلکہ انسانیت اور تہذیب کی اعلیٰ اقدار کے امین اور محافظ یعنی مدرس کی حیثیت سے بھی جوابدہ ہیں۔

جس طرح ہم زندگی کی صورت حال سے غافل نہیں رہ سکتے اسی طرح ملک میں تعلیم کی صورتِ حال سے بے خبر رہنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں۔ پچھلے دو سال میں تعلیمی دنیا کا سب سے بڑا واقعہ "دس جمع دو جمع تین" کے فارمولے کا نفاذ ہے ملک میں یکساں طرز تعلیم اور یکساں مدارج تعلیم کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے گو تعلیم اب بھی صوبائی حکومتوں کا شعبہ ہے لیکن اس کے باوجود جتنی یکسانیت ممکن ہے،

اس کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مقصد اس نئے فارمولے کا یہ ہے کہ دس سالہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارا طالب علم اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ ملازمت اور تجارت کے ضروری اصول جانتا ہو اور زندگی میں داخل ہونے کے قابل ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا زمانہ ہے اس لیے سائنس اور ریاضی دسویں جماعت تک اس کے نصاب میں شامل ہوں۔ اظہار اور وسائل اظہار زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔ لہٰذا زبان و ادب سے واقفیت لازم ہے۔ ہندوستان مختلف علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور ہر علاقے کی اپنی علاقائی زبانیں ہیں لہٰذا ان علاقائی زبانوں میں سے کم سے کم دو سے اس کی واقفیت لازم ہے۔ مغربی زبانوں کے ذریعہ ہم عالمی آگہی کی سطح تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے انگریزی یا کسی دوسری یوروپی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس طرح وہ کار زار حیات میں کام آنے والے وسائل و ذرائع سے لیس ہو کر اسکول سے باہر نکلتا ہے۔

یہاں تک کے کاروبار میں ہوں تو جامعات ہند میں پڑھانے والے اردو اساتذہ کا عمل دخل کچھ زیادہ نہیں لیکن غور کیجئے تو یہی وہ سطح ہے جہاں نگرانی ضروری ہے یہیں ہمارے طلبا کی ادبی خبر و نظر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اور یہیں اس کا مزاج اور کردار بنتا یا بگڑنا شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سطح پر اردو کا ایسا نصاب اور ایسا طریق تعلیم اپنانے کی ضرورت ہے جو ہمارے طلبا کو اردو ادب سے بنیادی واقفیت پیدا کرا سکے اور ہماری زبان کے مختلف پیرایہ اظہار کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا نصاب اور طریق تعلیم دونوں طلبا کے روزمرہ کے تجربات ہی سے نہیں بلکہ وسیع تر سماجی تقاضوں سے پوری ہم آہنگی رکھتے ہوں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ دسویں کے بعد دو سال کی مدت میں بی اے تک کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ادبی تعلیم و تدریس ضروری ہے۔ یہ گویا عبوری دور ہے جس میں طالب علم تفہیم و تلخیص عبارت سے آگے بڑھ کر ادبی ذوق کی مبادیات تک پہنچتا ہے۔ یہاں اس سوال پر غور کرنا ضروری ہے کہ زبان دراصل خیالات اور تصورات کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ الفاظ کے ذریعے خیالات، تصورات اور معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اب تک کوئی ایسی آواز، کوئی ایسا بامعنی لفظ ایجاد نہیں ہوا جو کسی نہ کسی تصور کو ادا نہ کرتا ہو۔ اسی لیے زبان کی تعلیم مقصود بالذات نہیں ہو سکتی زبان کی تعلیم یقیناً بعض تصورات کی ترسیل کرے گی۔ اور ان تصورات کے

اہم، مفید یا غیر اہم اور مضر ہونے کا فیصلہ تعلیمی مقاصد کے پیش نظر کرنا ہوگا
زبان سکھانے سے دو مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ایک زبان کو کامیابی کے ساتھ
وسیلۂ اظہار بنانے میں مدد پہنچانے کی مشق فراہم کرنا ظاہر ہے اس سلسلے میں ادب کے
شاہکار ایسے کارناموں کا مطالعہ مفید ہوگا جو ہماری زبان میں اظہار کے بہترین
نمونے ہیں اور جن میں مختلف پیرایے میں مافی الضمیر کو پورے تاثر اور حسن کے ساتھ
پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی تعلیم محض اس لئے نہیں ہونی چاہیے کہ وہ ادب کے
شاہکار ناموں سے واقف ہو جائے یا تاریخ ادب کے مختلف سلسلوں سے
واقف ہو جائے۔ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ پیرایہ اظہار کے
مختلف پیرایوں سے اس طرح واقف ہو جائے کہ انہیں موثر انداز میں خود برت سکے
ان ضروریات کو ملحوظ رکھنے کے بعد بی اے اور پھر ایم اے کے نصاب
اور طریق تعلیم کی تربیت لازم ہوگی۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند نے پچھلے
چھ اجلاسوں میں نصاب اور طریق تعلیم کے مسائل پر غور کرتی آئی ہے۔ ظاہر
ہے انجمن کا منصب اور مقصد جبریہ کوئی نصاب نافذ کرنا یا کوئی طریق تعلیم
رائج کرنا نہیں ہو سکتا۔ انجمن تو اپنے اجلاس میں صرف اساتذہ کی توجہ اہم مسائل کی
طرف مبذول کرا کے تبادلۂ خیالات کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔ اور اس تبادلۂ خیالات
سے البتہ مفید اور دور رس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ انجمن نے پچھلے دو سال میں اس
کے علاوہ بھی بعض اقدامات کئے ہیں۔ ان میں بعض کا ذکر جنرل سکریٹری کی رپورٹ
میں ملے گا۔ مثلاً پٹیالہ میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور کے
اشتراک سے انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند نے اردو کے نصاب پر ایک سہ روزہ سیمینار
منعقد کیا جس میں ماہرین لسانیات، ماہرین تعلیم، اردو کے مدرسین اور اہم
دانشوروں نے شرکت کی اور اردو کے نصاب اور طریق تعلیم کے مختلف پہلوؤں
پر غور کیا۔ مقالے پڑھے گئے اور بحث مباحثوں کے ذریعے بہت سی باتیں واضح ہوئیں
ہم سب نے بڑی دلچسپی سے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز کے تیار
کردہ اردو ابجد کا فلم بھی دیکھا اور ان کی تیار کردہ نصابی کتابوں اور ان کے لئے
مرتب کئے ہوئے ہدایت ناموں سے بھی استفادہ کیا۔ پھر ابھی چند روز پہلے ترقی اردو
بورڈ، نیشنل کاونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اور ٹریننگ اور دہلی سیکنڈری بورڈ
آف ہائر ایجوکیشن کے تعاون سے ایک ورکشاپ دہلی میں منعقد کیا گیا۔ جس
نے نویں اور دسویں کے اردو نصاب پر غور کیا اور اس سلسلے کو گیارھویں
بارھویں اور پھر بی اے اور ایم اے تک جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ——

ظاہر ہے کہ یہ اقدامات ابھی ابتدائی نوعیت کے ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ
حکومت ہند کا ترقی اردو بورڈ ایک مستقل نصابی سیکشن قائم کرے جو نہ صرف
مختلف اردو نصابات کو یکجا کرے بلکہ اردو نصابات کی تیاری کے سانی ضروریات
اور تقاضوں پر برابر نظر رکھے اور مناسب اداروں کے تعاون سے برابر ان
نصابات پر تجربات کی روشنی میں نظر ثانی کرتا رہے۔ اس ضمن میں بہار اسٹیٹ
حکومت کے بورڈ آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن کی تیار کردہ اردو کی نصابی کتب
"کیا بہار آ گیا" وغیرہ جیسی پیشکش تیار کردہ نصابات اور ترقی اردو بورڈ دہلی
حکومت جموں و کشمیر کے زیر نگرانی ورکشاپ میں تیار کردہ اردو نصابات
اور مکتبہ جامعہ کے سلسلہ معیاری ادب کی مطبوعات دہلی اور مشرقی اشاعت
کے زیر اہتمام کی جانے والی کوششوں کا تذکرہ ضروری ہے جن سے بہت کچھ
استفادہ ممکن ہے۔

پچھلے دو سال میں ایک اور مبارک کام یہ ہوا ہے کہ اتر پردیش اور بہار کی
پرائمری میں خاصے بڑے پیمانے پر مختلف سطحوں پر اردو اساتذہ کے تقرر عمل میں
آئے۔ یہ تقررات ضرورت سے بہت کم ہیں۔ اور ان میں دفتری نظام سے کافی
دشواریاں اور الجھنیں پیدا کی ہیں جن سے ان کی افادیت مجروح ہوئی ہے
لیکن اس لحاظ سے یہ اقدام مبارک ہے کہ ۲۷ سال کے بعد پہلی بار اتنے تقررات
عمل میں آئے ہیں۔ مدتوں تک اتر پردیش کے نئے تقررات والے اساتذہ کو
تنخواہ وظیفہ کے نام سے ملتی رہی تاکہ انہیں مستقل نوکری کا استحقاق حاصل نہ ہو
پھر یہ شرط لگائی گئی کہ ان کو دوسرے اساتذہ کی طرح باقاعدہ ٹیچرز ٹریننگ کی
ڈگری یا ڈپلومہ حاصل کر لینا چاہئے۔ اور اس سے قبل انہیں مستقل نہیں کیا
جا سکتا۔ یہ شرط بظاہر بڑی معقول ہے لیکن پورے اتر پردیش کے ٹیچرز ٹریننگ کالجوں
میں اکا دکا کے سوا کہیں بھی اردو مدرسوں کی ٹریننگ کا انتظام نہیں ہے اور جہاں
انتظام ہے وہاں اول تو داخلے بہت کم اساتذہ کو دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے ان
کی عملی ٹریننگ کے لئے اسکول نا پید ہیں۔ اور نئے طریق تعلیم کے مطابق نہیں کی جاتیں
ان تمام دشواریوں کے پیش نظر اتر پردیش اور بہار کی پرائمری کے اردو
اساتذہ کا ایک بڑا حصہ روزگار کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ظاہر ہے کہ بی لیول اور اس
کی سطح پر اردو پڑھانے والے اساتذہ اپنے روزگار کے مسائل سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے
جہاں یہ ضروری ہے کہ ان سبھی اساتذہ کی تربیت کے لئے بڑے پیمانے پر کچھ وقتی مدت
کے ٹریننگ کورس شروع کئے جائیں۔ اور ان کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو اور

حکومت کی طرف سے ان ڈگریوں کو مانا جائے وہاں یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ایم اے
کی سطح پر تدریس اور طریقِ تدریس کی ٹریننگ کا ایک اختیاری مضمون شامل
رہا کرنا کس حد تک مناسب ہوگا۔ اب تک تدریسی طریق کار کو ہمارے ایم اے کے
نصاب میں مناسب جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اب جب کہ اُردو مدرسین کی کھپت ہے تو یک
مضمون کو ایم اے کی سطح پر داخلِ نصاب کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ریفریشر
کورس، تربیتی کیمپ اور اس قسم کے دوسرے سمپوزیم اور ورکشاپ بڑی تعداد
میں منعقد کرنا بھی اس مقصد کے لیے مفید ہوگا۔

نصاب کے بارے میں ہمیں بطورِ خاص یہ ملحوظ رکھنا ہے کہ ... ہندوستان
کی طرح اردو میں بھی رنگا رنگی اور ہمہ رنگی کا جلوہ موجود ہے۔ ہر چند یکسانی اردو کا
روپ کسی نہ کسی حد تک متعین ہے۔ پھر بھی ہر علاقے کی اردو کا بھی اپنا روپ ہے اس کی
علاقائی وابستگی کا جلوہ صد رنگ الگ ہے اور اسی تنوع کو اردو کے نصاب
میں جلوہ گر ہونا چاہیے۔ ہر علاقے کی یونیورسٹیوں کو اپنا نصاب خود مرتب
کرنے کی آزادی تو حاصل ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے
کہ اس علاقے نے اردو کے جو ادیب پیدا کیے ہوں۔ ان کی نگارشات نصاب
میں شامل ہوں اور متعلقہ علاقے کی اردو بول چال کا مزاج بولی ٹھولی میں اردو کے
اسباق میں بھی نمایاں ہو۔ علاقائی ادبیات کی نمائندگی بھی نصاب میں ہو اور اس طرح
ہر جگہ کے نصاب تہذیبی رنگا رنگی اور علاقائی رنگ روپ کے ساتھ ساتھ میر
غالب، سرشار، سر سید، اقبال اور اکبر کی وراثت کی بوقلمونی میں جلوہ گر ہوں۔

ریسرچ کی سطح پر ہمارا کام اور بھی دشوار ہے۔ تحقیق کا مقصد محض ایسے
موضوعات پر کتابیں لکھوانا نہیں ہے جو خوش قسمتی یا بد قسمتی سے لکھنے والوں کی نظر
سے بچے رہے ہیں۔ اصل مسئلہ اس سے کہیں اہم ہے۔ کتابیں لکھنے کی صلاحیت پیدا
کرنا اور سکھانے کا ایک طریقہ ہے لیکن تحقیق دراصل ایک علیحدہ ڈسپلن ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی
کی سطح پر اس کا سیدھی معلومات کی کھتونی فراہم کرنا مقصد نہیں ہوتا بلکہ تحقیق میں دل
چسپی دکھانے والے طالب علم کے ذہن کو درجہ بندی، تجسس، شواہد کو جمع کرنے اور ان
کی جانچ پڑتال کا طریقہ سکھانا بھی ہے۔ اور استنباطِ نتائج کا فن اور
پھر اس فن سے مجموعی طور پر علم اور طریقِ علم کے عرفان میں اضافہ کرنا ہے، تاکہ
ہمارے طالب علم محض اردو کی خدمت ہی نہ کر سکیں۔ بلکہ زندگی کرنے کا ہنر
سیکھ سکیں گے۔ اور ٹکنالوجی کی دنیا بڑی پیچیدہ ہے اسے سمجھنے کے لیے سائنس
اور ٹکنالوجی سے واقفیت ضروری ہوگی اور ان کے قواعد کو علم کے دوسرے

شعبوں میں بھی برتنا ہوگا۔ لیکن زندگی محض سائنس کے ذریعے نہیں گزاری جا سکتی۔ اس کی اعلیٰ اقدار کو سمجھنے کے لئے آرٹ اور انسانی علوم کا سہارا لینا ضروری ہے۔ صرف پھول کا کیمیاوی تجزیہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے رنگ سے انبساط حاصل کرنا اور اس کی خوشبو سے نشاطِ زیست کا سامان بہم کرنا بھی زندگی کی نعمتوں میں سے ہے۔ ادبی تحقیق اس اعتبار سے اعلیٰ ترین سائنسی اور اعلیٰ ترین احساسِ جمال کا ایسا امتزاج ہے جو ادب ہی کے لئے نہیں زندگی کی تفہیم کے لئے لازمی ہے۔

ہماری زبان میں تحقیق کے آئین و آداب پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ گو اب کہیں کہیں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم۔ لٹ کے نصابات شروع کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں انگریزی کی کتابوں ہی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ متنی تنقید اور تصحیح متن پر دو ایک کتابیں اور دو چار مضامین ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر انگریزی کی کتابوں اور مضامین کے ترجمے یا تلخیص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تحقیق کے وسیلوں کی طرف توجہ کی جائے اور شواہد کے جمع کرنے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے، تجزیہ اور درجہ بندی، استنباط نتائج اور اخذ اصول کے ضوابط مستقل تصانیف کے موضوعات بنیں۔ ہماری زبان اور ہمارے ادب ہی کو نہیں، ہمارے مزاج کو زیادہ سائنسی، زیادہ معروضی، زیادہ معقولیت پسند ہونا ہے تاکہ جذباتیت کا دخل و توازن سے آشنا ہو اور ہمارا شاعرانہ پن زندگی کی حقیقتوں کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر دیکھ سکے۔ تحقیق کا یہ ذوقِ حق اور صداقت کے لئے یہ تجسس محض تعلیم کا بنیادی مقصد ہی نہیں ہے بلکہ شاید انسانی تہذیب کا سب سے بڑا وسیلہ اور انسانی زندگی کی اصلی منزلوں کی طرف رہنمائی کرنے والا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لئے مدتوں پہلے سقراط نے اپنے ایک طالب علم سے سوال کیا تھا "تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو کیا تم میں علم حاصل کرنے کی جرأت ہے" روشنی و صبح کو اسی لئے بلا سے تعبیر کیا گیا۔ دورِ حاضر کے ایک شاعر نے اسی لئے اپنے ہم عصروں کو دعا دی ہے۔۔۔

جن کو دیں پیروئ کذب و ریا ہے ان کو — ہمت کفر ملے جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو — دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

یہ ہمت کفر اور جرأت تحقیق، صحیح معنوں میں زندگی گزارنے کا گر ہیں کیونکہ انہیں سے [illegible] مشعلِ زندگی میں اور انسانی تہذیب کا کاروان منزل بمنزل رواں ہے اور جو علم ہمت اور جرأت پیدا کر سکتا ہو تو محض مدرسے کی ذہنی کاوش نہ ہوگا بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں کام آئے گا۔

مگر تحقیق میں جرأت پہلا سبق ہے آخری نہیں۔ اردو کی تحقیق کرنے والے جن گوہر کو نکمکار میں ان کا شمار دشوار ہے۔ انگریز نے ہندوستان کو سیاسی نادی ہے دی مگر انڈیا آفس لائبریری کے علمی خزانے نہیں دیئے۔ مشرقی علم و دانش کدہ کے بارے میں دیکھ کر اقبال کا دل ہی پارہ پارہ ہوا تھا اور "تن دیدہ دل دو شو کنند چشم زلیخا" کا مضمون یاد آیا تھا۔ آج بھی مغرب کے آغوش میں جگمگا رہا ہیں اور مخارن ایکسچینج کی دقتوں کے باعث اردو کے عام محقق کی دسترس سے دور ہیں ضرورت اس کی ہے کہ ہندوستان کے مختلف ذاتی اور عام کتب خانوں کے اہم مخطوطات محفوظ کر لیئے جائیں اور ان کے عکس مختلف ریسرچ لائبریریوں کے لیئے مہیا کیئے جائیں۔ یہی نہیں بلکہ ملک کے باہر مختلف کتب خانوں میں محفوظ مخطوطات کے مائیکرو فلم اور فوٹو اسٹیٹ نقلیں بھی سرکاری سطح پر محفوظ کر لی جائیں تاکہ وہ آسانی سے مہیا ہو سکیں۔ ہم امیر خسرو انیس اور اقبال کی برسیاں منانے والے ہیں لیکن اپنے ان سپوتوں کے سبھی کارنامے ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ اور ان پر ہم کتابیں اور مضامین کی فہرست تک ٹھکانے سے مرتب نہیں ہوتی ہے۔ یہ سب کام اردو اساتذہ اور دو تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے طلبا کی توجہ کے محتاج ہیں۔

اردو تعلیم و تدریس کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت عالمی معیاروں تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ ہم اپنے ادب کو عالمی ادب کے پس منظر ہی میں سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا ادب عالمی جمالیات کے آئینے ہی میں سنور اور نکھر سکتا ہے اور ہم عالمی تہذیب کے شعور کے بغیر اپنے آپ کو بھی کما حقہ پہچان نہیں سکتے۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہم صرف عالمی ادب کے میلانات و رجحانات، کارناموں اور مشاہیر سے واقفیت تک محدود رہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم عالمی ادب کی اقدار سے واقفیت رکھتے ہوں اور انہیں معیاروں سے شناسائی رکھتے ہوں جن کی بنا پر عالمی ادب کے شاہکار عزت اور احترام کے لائق ٹھہرے ہیں اور جن کی بنا پر صدیاں گزر جانے کے بعد اور ہزاروں میل کے فاصلے کے بعد بھی یہ شہ پارے ہمارے دلوں کو گرماتے اور ہماری روح کو تڑپاتے ہیں۔

اسی مسئلے کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اردو ادب کھڑی بولی کی روایت کا حصہ ہے جو ہمارے دیس میں پیدا ہوئی۔ یہیں پلی بڑھی اور پروان چڑھی مگر اس نے عالمی تہذیب سے غذا لی اور ترک ایرانی تہذیب سے خصوصاً علامتوں اور تلمیحوں کے چراغ روشن کئے اور حافظ، سعدی اور خیام کی روایات سے تعلق کی پائی مگر وہ ہندوستان کے مزاج اور ماحول سے کسی طرح الگ نہیں رہی اور اس کی جڑیں یہیں کے ساتھ اور یہیں کے رواج میں پھیلیں اور بڑھیں۔ اس لحاظ سے ہم ہندوستان کی اس مشترک سرگزشت سے اپنا

رشتہ کاٹ نہیں سکتے جو صرف اردو ہی کی نہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بھی تھی اور ہے اور بالخصوص کھڑی بولی ہندی کی سرگزشت ہے۔ ان جذبات احساسات افکار و تصورات کی مشترک داستان دوسری ادبیات کی کڑیاں جوڑ کر بھی اجاگر کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو ادب کی تعلیم و تدریس کے رشتے لازمی طور پر کھڑی بولی ہندی سے بالخصوص اور ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے ادب سے بالعموم ملتے ہیں۔

اس ضمن کی تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ادب محض جمال کا آئینہ خانہ نہیں وہ افکار اور تصورات کی دنیا بھی ہے وہ تاریخ کا جنم داتا اور تاریخ کا پیدا کردہ (مخلوق) اقدار بھی ہے۔ اس لحاظ سے کسی ادب کا مطالعہ ان سماجی عوامل و محرکات کے بغیر نہیں کیا جا سکتا جو سماج کی تشکیل میں کبھی بالواسطہ کبھی بلاواسطہ حصہ لیتے ہیں۔ اس صورت میں ادب کا مطالعہ براہ راست سماج ہی کا نہیں انسان کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ اور HUMANITEIS کے اعلیٰ ترین مدارج کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ اگر ادب سماج ہی کا نہیں بلکہ علم و دانش کا ایک ناگزیر حصہ ہے تو ہر لمحہ بدلتی اس دنیا میں اس کے مطالعے کے رنگ و آہنگ بھی لازمی طور پر بدلتے رہیں گے اور استاد کی حیثیت سے شاید ہمارا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ ہم اپنے اور اپنے طالب علموں کے ذہن میں علم و ادب کے متلاطم اور متصادم تصورات کی تصویر پیش کریں GILBERT HIGHET نے بجا طور پر لکھا ہے

ITIS OUR DUTY. THEREFORE, INDEED ITIS ONE OF OUR CHIEF FUNCTIONS AS TEACHERS, TO SHOW THEM THAT THE WORD OF THE INTELLECT IS IN CONSTANT FLUX, THAT OUR MINDS ARE ALWAYS RECHING AND GRAPPING WITH NEW CHALLENGES, AND THAT THE MOST IMPORTANT PART OF OUR WORK IS DISCOVERY AND REINTER PRETATION AMERICAN SCHOLARY P 72/529

بس اسی امید پر اس دراز نفسی کو ختم کرتا ہوں کہ ہمارے مذاکرات سے اس جستجو اور تلاش، اس فکر اور اضطراب کو نئی تقویت ملے گی۔ اور ٹیپو سلطان جیسے مجاہدوں اور صمد شاہین کے نیا دور اور محمود ایاز کے سوغات کے شہر سے اردو ادیبوں اور مدرسوں کا یہ کارواں نیا اعتماد اور نیا حوصلہ لے کر واپس جائے گا۔ گلبرگہ کی یہ سرزمین اللہ کے گھواروں میں گنی جانی چاہیے کیوں کہ یہیں صوفیا کے بے لوث قافلے نے خدمت خلق کی لگن سے عوام بول چال کی زبان عطا کی اور معرفت کے سرچشمے ملے اور

یہیں والا جاہی فرماں رواؤں سے اس روایت کو نئی شائستگی اور نئی لطافت بخشی۔ تعجب نہ ہوگا کہ اگر یہاں کے فیضان سے اردو اساتذہ مستقبل کے نئے خواب اور منصوبے ساتھ لے کر واپس جائیں۔

ہمارے سامنے مادی وسائل کی دقتیں ہیں۔ ہمیں اردو تحقیق کے وسائل میں باہمی ربط اور ارتباط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ دیگر زبانوں اور قلم اور فوٹو اسٹیٹ مشینوں کے مکمل ذخیرے اور مضبوط اور تفصیلی فہرستوں کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بار بار نصابی ضرورتوں پر نظر رکھنا لازم ہے تاکہ بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیا جا سکے اور ہمارا نصاب وقت کے ہم رکاب رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اردو اساتذہ کے تربیتی پروگرام کو تیزی کے ساتھ شروع کرنا بھی لازم ہے اور ہو سکے تو اس تربیتی پروگرام کو ایم اے (اردو) کے نصاب کا اختیاری جز بنانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایسے مسائل بھی ہیں جو اردو والوں ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ متعلقہ اردو کے اساتذہ کی مدد اور بہبودی کے لئے ایک مرکزی فلاحی فنڈ قائم کرنے کی ضرورت ہے جس سے بوقت ضرورت ضرورت مند اساتذہ کو فوری مدد مل سکے۔ اس سلسلے میں انجمن نے کچھ خط و کتابت کی ہے۔ مگر معاملہ ہنوز ابتدائی مرحلے میں ہے۔ پھر ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کو دنیا میں اردو پڑھانے والے مراکز سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ عالمی مراکز میں اس دیس کی آواز سنی جا سکے جہاں اردو پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور غفلت کا شکار ہے۔ غرض مسائل کا ایک سلسلہ ہے جو اردو اساتذہ کے کارواں کو نئی منزلوں کی طرف بڑھ چلنے کے لئے للکار رہا ہے۔ میں آپ کی توجہ ان مسائل کی طرف دلاتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان مسائل کو حل کر کے ہمارا قافلہ ایک تازہ سے جہانِ تازہ کی تعمیر کر سکے گا۔

رپورٹ

صدرِ محترم

اراکینِ مجلس استقبالیہ

و حاضرینِ اجلاس!

دانش گاہوں کے اردو اساتذہ کا یہ اجتماع اورنگ آباد کانفرنس کے بعد کم و بیش دو سال کے وقفے سے ہو رہا ہے۔ دستور کے مطابق انجمن اساتذہ اردو کا اجلاس سال بہ سال ہونا چاہیے۔ اس بے جا تاخیر کے لیے انجمن یا اس کے عہدہ دار ذمہ دار نہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ۱۹۷۳ء کی اورنگ آباد کانفرنس میں طے پایا تھا کہ اساتذہ اردو کا چھٹا سالانہ اجتماع اکتوبر ۱۹۷۴ء میں بہار یونیورسٹی مظفر پور کے زیر اہتمام ہوگا۔ اسی موقع پر یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ مجوزہ اجلاس میں غیر ملکی اساتذہ اردو کو بھی مدعو کیا جائے۔ چنانچہ ایک سال تک مظفر پور کے اجلاس کی تیاری کی گئی۔ بہار یونیورسٹی میں کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے کنوینر جناب اختر قادری اور ان کے رفقاء نے اس سلسلے میں بڑی سرگرمی اور جوش و خروش سے کام کیا۔ اس مقصد کے لیے وہ خود دہلی آئے، اور کانفرنس کے بارے میں انجمن کے عہدہ داروں سے گفتگو کرکے تفصیلات طے کیں۔ اس کانفرنس کا ایک دلچسپ اور اہم اجلاس "بین الاقوامی سیمینار" تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سوویٹ یونین، انگلستان، امریکہ، چیکوسلاواکیہ، اٹلی، جاپان ماریشس اور بنگلہ دیش جیسے ملکوں میں اردو اساتذہ عرصۂ دراز سے جن طریقوں اور اصولوں کے مطابق اردو زبان و ادب کی تدریس کا کام کر رہے ہیں ان سے ہم ہندوستان کے اساتذہ بھی روشناس ہوں۔ بالخصوص زبان اور رسم الخط سکھانے کے میدان میں انہوں نے جو تجربے کیے ہیں جو نئے وسیلے اور طریقے اختیار کیے ہیں ہم ان کو سمجھیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بھی ہمارے تجربات اور طریقوں سے استفادہ کا موقع ملے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس سیمینار کی ذمہ داری ہمیں سونپی گئی۔ چنانچہ تقریباً آٹھ ماہ تک ہم نے مذکورہ ملکوں کی دانش گاہوں اور ثقافتی اداروں کے سربراہوں اور وہاں کے اردو اساتذہ سے خط و کتابت کی اور ہمیں بتاتے ہوئے خوشی ہے کہ بیشتر ملکوں کے اردو اساتذہ نے ہماری دعوت پر کانفرنس اور مذاکروں میں شرکت کے لیے اپنی رضامندی بھیج دی۔ ان غیر ملکی مندوبین کے بارے میں حکومت ہند نے بھی اجازت دے دی۔ وزارت تعلیم نے اس سلسلے میں مطلق

اعانت اور تعاون کا یقین دلایا۔ خیال تھا کہ غیر ملکی اردو معلموں اور اردو کے معلموں کی شرکت سے ہماری انجمن کا یہ اجتماع اس کی تاریخ میں یادگار رہیگا لیکن اچانک بہار میں سیاسی حالات اور ہواؤں کے تیور بدل گئے۔ وہاں کی دانش گاہیں سب سے زیادہ اس کی زد میں تھیں۔ تعلیمی نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہنگامے بڑھنے لگے۔ دوسرے ممالک کے اردو اساتذہ کو بہت پہلے مدعو کیا جا چکا تھا اگست اور ستمبر ۱۹۷۴ء کے دو مہینے بڑے اضطراب اور تذبذب میں گزرے پہلے یہ سوچا گیا کہ کانفرنس ملتوی کر دی جائے۔ لیکن جب مستقبل قریب میں حالات کے روبہ اصلاح ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو بہار یونیورسٹی (مظفر پور) کی مجلس استقبالیہ نے ہمیں مطلع کیا کہ کانفرنس کا انعقاد ممکن نہیں ہے اس طرح ستمبر ۷۴ء کے آخر میں کانفرنس کے منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا گیا

اب سوال یہ تھا کہ کانفرنس کہاں ہو اور کیونکر ہو؟ کسی دوسری یونیورسٹی کا دعوت نامہ ہمارے پاس نہیں تھا۔ بعض دانش گاہوں کے سربراہوں سے گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ سال رواں کے بجٹ میں اتنی بڑی کانفرنس کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اور یو۔ جی۔ سی سے گرانٹ حاصل کرنے میں سات آٹھ ماہ لگ جائیں گے۔ ان کا عذر معقول تھا۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کے ابتدائی مراسلے بھی ہمت افزا نہیں تھے لیکن ہماری خواہش تھی اور اصرار بھی کہ یہ کانفرنس ارض دکن میں ہو۔ جہاں اردو کے چراغ اب تک باد مخالف کے جھونکوں سے محفوظ ہیں۔ بالآخر ہمارے اصرار پر ڈاکٹر آمنہ خاتون کے حوصلے بلند ہوئے۔ بنگلور یونیورسٹی کے محبوب وائس چانسلر اور کرناٹک کے ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ایچ نرسمہیا نے بڑی فراخدلی اور خوشی سے اردو اساتذہ کے اجتماع کے لئے اجازت مرحمت کی۔ اور اس طرح اساتذۂ اردو کے کارواں کو کشمیر، دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ کے بعد جنوب میں پہلے اورنگ آباد اور پھر بنگلور کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا چونکہ کانفرنس کی تیاری کے لئے کافی وقت درکار تھا۔ اس لئے انجمن کے صدر پروفیسر محمد حسن نے اس دوران اردو زبان و ادب کی تدریس و تعلیم کے مسائل پر مذاکرہ کرنے کے لئے بعض دوسرے اداروں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ہندوستانی زبانوں کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ (میسور) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ پٹنائک نے خاص دلچسپی اور سرگرمی کا اظہار کیا۔ نتیجہ میں انجمن اساتذہ اردو اور ان کے انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے پٹیالہ میں اپریل ۷۵ء میں ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا۔

اُردو زبان کی تعلیم اور نصاب۔ تعلیم کے موضوع پر اپنی نوعیت کا سب پہلا اہم مذاکرہ تھا جو تین روز تک جاری رہا اور جس میں اساتذہ کے علاوہ تعلیم اور علم زبان کے ممتاز ماہرین نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اکثر اساتذہ اردو نے اس مذاکرے میں شرکت کے لئے کشمیر، راجستھان، یو پی۔ بہار۔ مدھیہ پردیش۔ مہاراشٹر۔ ہماچل پردیش۔ آندھرا۔ کرناٹک۔ تامل ناڈو اور دلی کی دانش گاہوں کے نمائندہ اساتذہ کو نامزد کیا تھا۔ ان کے علاوہ آسام اور پنجاب کے اردو اساتذہ نے بھی شرکت کی۔ مذاکرہ میں ملک کے مختلف علاقوں میں اردو کی تعلیم کی موجودہ صورتِ حال، نصابات اور طریق تعلیم کا جائزہ مختلف زاویوں سے لیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں صدر انجمن پروفیسر محمد حسن نے مذاکرہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ اسکولوں، کالجوں اور دانش گاہوں میں اردو زبان و ادب کی تدریس و تعلیم کے سلسلے میں ہمیں اپنے رویے میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہیں۔ ملک کی اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی تدریس کے میدان میں آج جو تجربے ہو رہے ہیں جن نئے بصری اور سماعی وسائل سے کام لیا جا رہا ہے ان سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے موضوع کے اعتبار سے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ملک کے مختلف علاقوں میں اُردو کی تعلیم کے نظام اور اس سے وابستہ مسائل کا جائزہ۔

اس ذیل میں ڈاکٹر محمد یوسف کوکن (مدراس) ڈاکٹر عبدالستار دلوی (بمبئی) جناب آر کے۔ منوچہر (مدھیہ پردیش) جناب حبیب صاحب (آسام) جناب ہاشم علی (کرناٹک) جناب عبدالحئی (کشمیر) اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے مقالات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں علاقائی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اردو کی تعلیم کے نظام کو بہتر بنانے کے کچھ ٹھوس تجاویز بھی پیش کی گئی تھیں۔

۲۔ پہلی، دوسری یا مادری زبان کی حیثیت سے اردو زبان اور رسم الخط سکھانے کے طریق کار اور اس ضمن میں لسانیات کی اہمیت۔

اس ذیل میں جو مقالے پڑھے گئے۔ ان میں پروفیسر محمد حسن۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ ڈاکٹر کے۔ کمار سوامی۔ جناب نصیر احمد خاں۔ جناب ایم۔ ایز۔ یو اکوا۔ ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ دعا۔ ڈاکٹر جواہر لال ہنڈو اور قمر رئیس کے مقالات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر گوسوامی نے یہ دلچسپ بحث بھی اٹھائی کہ کیا مادری زبان لازمی طور پر پہلی زبان ہونی چاہئے؟ عام طور پر اس رائے سے اتفاق کیا گیا کہ مادری زبان نظام تعلیم میں دوسری اور تیسری زبان بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اور نصیر احمد خان نے اردو زبان کی تدریس میں لسانیاتی طریق کار پر زور دیا اور وضاحت کے ساتھ کچھ تجاویز پیش کیں۔ رسم الخط سکھانے کے مختلف طریقے بھی زیر بحث آئے۔

۳۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو نصابات، درسی کتب کی تدوین اور تدریسی مواد کی فراہمی کا مطالعہ۔

اس ذیل میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد عقیل زیدی، جناب معین الدین، ڈاکٹر جے۔ این۔ ہانڈو، ڈاکٹر شارب ردولوی اور میر محمد معین کے مقالے خاص اہمیت کے حامل تھے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ایم اے اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پیش آنے والے بہت سے اہم مسائل پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر نارنگ نے مرکزی یونیورسٹیوں میں رائج ایم اے کے نصاب کی اصلاح کے بارے میں خیال انگیز باتیں کہیں۔ محمد معین نے تعلیمی نقطۂ نگاہ سے اردو کی درسی کتب میں سماجی رویوں کا تجزیہ کیا۔ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کے مقالے اور بعض دوسرے پرچوں کی تحریک پر اردو کی تعلیم میں جدید سماعی اور بصری ذرائع سے مدد لینے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ ڈاکٹر پٹنائک اور ڈاکٹر اے۔ این کول پرنسپل سنٹرل شمالی السنہ ہند پٹیالہ نے اپنی لسانیاتی لیبورٹری میں اردو، ہندی اور دوسری شمالی علاقائی زبانیں اور ان کا رسم الخط سکھانے کے لئے سماعی اور بصری ذرائع کے استعمال کا مظاہرہ کیا جسے مذاکرہ کے شرکاء نے سراہا۔

یہ اس کی روداد کا ناقص خلاصہ ہے۔ مقالوں کے علاوہ وہ بحث بھی خیال انگیز تھی جو مختلف اجلاسوں میں ہوئی۔ اس کے شرکاء کو احساس ہوا کہ ان کے مسائل کی اصل نوعیت کیا ہے؟ وہ کس طرح دوسرے مسائل سے جڑے ہوئے ہیں اور انھیں حل کرنے کے لئے کیا ٹھوس قدم اٹھانا ہیں۔ عام طور پر اس پر اتفاق رائے تھا کہ اس وقت ہندی اور غیر ہندی علاقہ میں ابتدائی اوسط اور ثانوی سطح پر اردو کے نظام تعلیم کو بہتر بنانے کا کام ترجیحی اہمیت رکھتا ہے۔ روایتی درسی کتب میں نہ صرف اصلاح کی ضرورت ہے بلکہ نئی ضرورتوں کے تحت انھیں پھر سے مرتب کیا جانا چاہئے۔ تاکہ نیا نصاب تعلیم زیادہ دلچسپ موثر اور نتیجہ خیز ہو۔ اس سلسلے میں اساتذہ کی تربیت پر بھی زور دیا گیا۔ ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ پٹنائک نے بتایا کہ علاقائی زبانوں کے بعض مرکزوں (مثلاً سولن میں) اردو اساتذہ کی تربیت کا بھی انتظام ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عبدالعلیم نے اپنی تقریروں میں حاضرین کو یقین دلایا کہ ترقی اردو

بورڈ بھی اس میدان میں عملی اور امکانی تعاون سے دریغ نہیں کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ بورڈ جلد ہی اسکولوں میں اردو نصاب کے جائزے اور اس کی ترتیب نو کے مقصد سے مذاکرے اور ورکشاپوں کا انتظام کرے گا۔ اور نئی مرتبہ درسی کتابیں ماڈل کے طور پر شائع کرے گا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سطح پر بھی پروفیسر عبدالعلیم نے درسی کتابوں اور اردو کی مختلف اصناف کے شہ پاروں کے جامع انتخاب شائع کرنے کا وعدہ کیا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے بھی اس سلسلے میں اپنے تعاون کا یقین دلایا اور بعض اہم تجاویز پیش کیں۔

یہاں اردو اساتذہ کے ایک دوسرے اجتماع کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا جو ۳۰ اور ۳۱ مارچ ۷۵ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ اس کا اہتمام اتر پردیش کے اسکولوں کے اردو اساتذہ کی ریاستی انجمن کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی تیاری اور پروگرام کی ترتیب کے کاموں میں اس کے سکریٹری جناب اظہار احمد کی دعوت پر ہم نے بھی امکانی تعاون کیا۔ صدر انجمن پروفیسر محمد حسن نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے کانفرنس کو خطاب کیا۔ وہاں اندازہ یہ ہوا کہ حکومت کے بدلتے ہوئے رویے کے زیر اثر یوپی کے اساتذہ اور عام اہل اردو میں ایک نئی بیداری اور خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا معیار اور مستقبل براہ راست اسکولوں میں اردو کی تعلیم سے وابستہ ہے۔ اگر ابتدائی اوسط اور ثانوی سطح پر اردو کے نظام تعلیم میں ترقی و توسیع ہوگی، نصاب تعلیم اور طریق تعلیم بہتر ہوگا۔ تربیت یافتہ باصلاحیت استاد طلبہ میں اردو کی تعلیم کا شوق اور شعر و ادب کا ذوق پیدا کریں گے تو اعلیٰ تعلیمی سطح پر بھی معیار بلند ہوں گے۔ ہمیں اس کا اندازہ ہوا کہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے نظام اور اساتذہ سے رابطہ قائم کر کے اور ان کے تعاون سے ہم اپنے بہت سے مسائل کو نہ صرف سمجھ سکتے ہیں بلکہ سلجھا بھی سکتے ہیں۔

پٹیالہ کے مذاکرے میں بھی اردو کی تعلیم کے مختلف مراحل اور مدارج میں تال میل پر خاص زور دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم چیرمین ترقی اردو بورڈ نے یقین دلایا تھا کہ وہ اسکولوں کے ثانوی درجات اور بی۔ اے (آنرز) کے نصاب تعلیم کی از سر نو تدوین اور درسی کتب کی اشاعت کے کاموں میں ہر ممکن امداد کریں گے۔ چنانچہ گزشتہ چند ماہ کے عرصے میں ہم نے اس سلسلے میں ترقی اردو بورڈ سے برابر رابطہ قائم رکھا۔ صدر انجمن نے ترقی اردو بورڈ کے سامنے بی۔ اے کے ایک معیاری نصاب کی تیاری کے لئے ورکشاپ قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور ملک کی آٹھ ریاستوں کے ایسے اردو اساتذہ کی فہرست بھی دی جو مجوزہ ورکشاپ میں حصہ لیں۔ ترقی اردو بورڈ کے ذمہ داروں نے اس پر اصرار کیا کہ دس

جمع دو صبح تین کے نئے فارمولے کے تحت مناسب ہوگا کہ ابتدا سے درجہ بدرجہ نصاب مرتب کیا جائے اور اس سلسلے میں اولاً دلی کے مدارس کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھا جائے جہاں اس نئے فارمولے کا نفاذ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس تجویز کے تحت ترقی اردو بورڈ نے ایک ورکشاپ کمیٹی تشکیل دی۔ جس کے پہلے جلسے میں نویں اور دسویں جماعتوں کے اردو نصاب کے مقاصد اور اس کی تدوین کے بنیادی اصولوں پر غور و فکر کیا گیا اور اس کے بعد ۹، ۱۰، ۱۱ اور اکتوبر کو سہ روزہ ورکشاپ ہوا جس میں طے شدہ اصولوں اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی سفارشات کی روشنی میں کمیٹی نے ایک نصاب مرتب کیا۔ عنقریب اسے آخری اور حتمی شکل دی جائے گی۔ اس کے بعد آگے کے درجات اور پھر پورے نصاب پر غور ہوگا۔ کمیٹی کی کوشش یہی ہے کہ نیا نصاب نہ صرف ہمارے ملک میں اردو کی موجودہ صورت حال اور زبان و ادب کی تعلیم کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو بلکہ وہ اتنا جامع متنوع اور معیاری ہو کہ دوسری ریاستوں میں بھی جہاں اس فارمولے کا نفاذ ہوا ہے شامل نصاب کیا جا سکے۔ امید ہے کہ اس اجتماع کے اجلاسوں میں بھی نصاب پر غور و فکر کرتے ہوئے اس نئے فارمولے کی ضرورتوں اور تقاضوں کا لحاظ رکھا جائے گا۔ بحث کے نتائج یا سفارشات سے ترقی اردو بورڈ کی کمیٹی بھی استفادہ کر سکے گی۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ انجمن کی سرگرمیاں صرف سالانہ کانفرنسوں تک محدود نہ رہیں بلکہ وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم اور اساتذہ اردو کے لئے ایک مرکزی، فعال اور مستقل ادارہ ہو۔ اتر پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش اور بعض دوسرے علاقوں کے اساتذہ اور اردو دوستوں نے ہمیں جن مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے اور ہمارا تعاون چاہا ہے، ہم نے امکانی اعانت سے دریغ نہیں کیا ہے۔ صدر انجمن سکریٹری اور آفس سکریٹری ڈاکٹر شارب ردولوی انجمن کی تجاویز پر عمل درآمد کرانے اور اساتذہ کے مسائل کو سلجھانے کے لئے مسلسل خط و کتابت کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں احساس ہے کہ بعض دشواریوں کی بنا پر ہماری سرگرمیاں زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکی ہیں۔ سب سے بڑی دشواری اردو اساتذہ کے تعاون اور دلچسپی کی کمی ہے۔ مالی طور پر بھی انجمن کے وسائل ایسے نہیں کہ ہم اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے سکیں۔ انجمن کی کانفرنسوں میں مختلف مقاصد کے لئے جو کمیٹیاں بنتی ہیں ان کا ایک جلسہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اس لیے کہ انجمن کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں کہ اراکین کو دوسرے درجے کا کرایہ بھی دیا جا سکے۔

انجمن کے عہدہ داروں نے گزشتہ دو سال میں اساتذہ اردو کو ذاتی سطح پر خط لکھ کر اپیل کی کہ وہ انجمن کی سالانہ فیس رکنیت مبلغ پانچ روپے پابندی سے بھیجتے رہیں۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سارے تگ و دو کے باوجود انجمن کے باضابطہ اراکین کی تعداد دو ڈھائی سو سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ جبکہ اساتذہ اردو کی مجموعی تعداد پانچ سو سے

قدیر امتیاز
جز وقتی لکچرر شعبۂ اردو بنگلور یونیورسٹی

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اکتوبر ۷۵ء میں کانفرنس ہوئی۔ جولائی ۷۵ء کے آخری ہفتے میں قدیر امتیاز صاحب شعبے میں لکچرار ہوئے۔ اس قلیل مدت میں جو امور وہ دیکھ یا سن سکے انھیں اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

دہلی کانفرنس کے بعد سے یہ خبر اردو حلقوں میں مسلسل گشت کرتی رہی کہ بنگلور میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ یہ کانفرنس کب ہوگی۔ ابھی طے نہیں ہو پایا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ اس بات کے لئے کوشاں رہیں کہ شہر بنگلور میں انجمن کی کانفرنس ہو۔ اس سلسلے میں ارباب اقتدار اور متعلقہ لوگوں سے آپ نے ربط قائم کیا۔ ان سے گفت و شنید کی، اور ایک سازگار ماحول بنایا۔ جس کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بندھ گئی تھی کہ عنقریب یہ کانفرنس ہوگی۔

اس اثنا میں پروفیسر آل احمد سرور کا خط آیا۔ موصوف نے ۱۹ دسمبر ۷۴ء کے خط میں اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ یہ کانفرنس بنگلور ہی میں ہو۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب ردولوی اور دوسرے احباب کے خطوط آتے رہے جس میں اس تجویز کو سراہا گیا کہ کانفرنس بنگلور میں ہو۔ پٹیالہ کے اردو سیمینار میں بھی ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ نے مسئلے پر گفت و شنید کی، اور بالآخر طے پایا کہ یہ کانفرنس ماہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں بنگلور میں ہوگی۔ اس اعلان کے بعد بہتوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ شہر بنگلور اپنی خوبصورتی اور قدرتی حسن کی وجہ سے ہمیشہ باعث کشش رہا ہے۔

بنگلور کانفرنس کے اعلان کے بعد سے یہ افواہیں بھی گشت کرتی رہیں کہ یہ کانفرنس کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ نئے کیمپس میں مہمانوں کا خاطر خواہ انتظام [illegible] مہمانوں کو مایوسی ہوگی۔ اور نہ جانے کیا کیا [illegible]

رہی لیکن ایک شخصیت افواہوں کی ان آندھیوں میں امید کا چراغ لے کر مردانہ وار ہوا کے سامنے چلتی رہی اور اس نے اپنے حسن انتظام سے لوگوں کو ششدر کر دیا بہتوں کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔ اور بعض انگشت بدنداں رہ گئے۔ جی ہاں یہ آہنی ارادہ رکھنے والی شخصیت ڈاکٹر آمنہ خاتون کی ہی تھی جو صرف دو ایک رفقاء کے تعاون سے یہ وسیع کام کر رہی تھیں۔

جب وہ انگلینڈ سے لوٹتے ہی انھوں نے کانفرنس کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ڈاکٹر صاحبہ بیٹھی خطوط کے جوابات تحریر کر رہی ہیں۔ کبھی کانفرنس کا پروگرام بھیجا جا رہا ہے، کبھی ریلوے کنسیشن فارم مندوبین کو پوسٹ کئے جا رہے ہیں۔ کبھی شعبے میں داخل ہوتے ہی وہ پوسٹ دیکھ رہی ہیں، کبھی مجھ سے دریافت کر رہی ہیں کہ کتابوں کی نمائش کا کام کیسا چل رہا ہے۔ مجھ سے بھی کہتی جا رہی ہیں کہ میں ان کے کام میں ہاتھ بٹاؤں۔

اور پھر خطوط اور ٹیلی گرام کی بارش کا زمانہ آ گیا۔ ڈاکٹر صاحبہ آتے ہی خطوط چھانٹ رہی ہیں، کچھ خطوط چھانٹ کر وہ میرے حوالے کر رہی ہیں اور مجھے سمجھاتی جا رہی ہیں کہ فلاں صاحب ٹرین سے، فلاں صاحب بس سے، اور فلاں صاحب طیارے سے آ رہے ہیں وہ اپنے بٹوے سے رقم نکال کر میرے حوالے کر رہی ہیں کہ آنے میں (شہر سے کیمپس تک) دیر ہو تو فوراً انھیں کسی اچھے ہوٹل میں ان کی حسب خواہش کھانا کھلاؤں، ساتھ ہی میری ہمت بندھوا رہی ہیں کہ کام کرنے والے تو ہمیشہ دو ایک ہی ہوتے ہیں۔ آپ سے مجھے تعاون کی امید ہے۔ کبھی وائس چانسلر تو کبھی رجسٹرار سے گفت و شنید کر کے شعبے کو لوٹ رہی ہیں۔ کبھی پریس میں بیٹھی دعوت نامے چھپوا رہی ہیں اور کبھی دعوت نامے تقسیم کرنے کے لئے دے رہی ہیں۔ انھیں اس سرگرمی سے کام کرتا دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ اللہ سب کو ایسی ہی انتظامی قابلیت عطا فرمائے۔ ڈاکٹر صاحبہ بیٹھی چپراسی اور شعبۂ اردو کے طلبہ اور طالبات سے کانفرنس کے کام کروا رہی ہیں۔ فائل اور بیاج الگ کئے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنی کار میں بٹھا کر کبھی مردانہ ہاسٹل اور کبھی زنانہ ہاسٹل لے جا رہی ہیں۔ متعلقہ لوگوں کو ہدایت دے رہی ہیں زنانہ ہاسٹل میں مندوبین کے قیام کا انتظام ہو رہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں شہاب الدین صاحب انجینئر سے بات کر رہی ہیں پلنگ اور ضروری سامان مزدوروں کے ذریعے کمروں میں رکھوائے جا رہے ہیں، جناب شہاب الدین صاحب سے گفتگو ختم کر کے وہ انچارج وارڈن سے ہمکلام ہیں ان سے پوچھ رہی ہیں کہ ہاسٹل سے سامان کی کیا سہولتیں مل سکتی ہیں۔ کبھی مولوی محمد خان صاحب سے ساز و سامان کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کر رہی ہیں۔ مولوی محمد خان صاحب ہمہ تن اس کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون نے شہر بنگلور کی انجمنوں کو کانفرنس کے سلسلے میں
مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ اگر وہ مندوبین سے ملاقات کے خواہشمند ہیں یا انہیں
مدعو کرنا چاہتے ہیں تو آگاہ کریں۔ ۲۵ ستمبر کے ان مکتوبات کے جواب میں انہوں نے چپ
سادھ لی۔ اور بعض اصحاب نے سرد مہری کا ثبوت دیا۔ سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن
کرناٹک کے معتمد عمومی نے ۲۲ اکتوبر ۷۵ء کے خط میں لکھا کہ وہ مندوبین کو مدعو کرنے
سے قاصر ہیں۔ موصوف نے دعاؤں ہی پر اکتفا کیا۔ مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی
نے لکھا کہ مجلس منتظمہ کے اجلاس کے بعد ہی وہ اپنے فیصلے سے مطلع کریں گے
اور آخری وقت تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ البتہ گورنر کرناٹک شری موہن لال
سکھاڈیہ اور وزیر حمل و نقل جناب محمد علی صاحب نے میزبان بننے پر آمادگی اور خوشنودی
کا اظہار کیا۔ اور ساتھ ہی ضیافت کی تاریخوں سے مطلع کیا۔

اساتذہ بنگلور کو جناب ڈاکٹر آمنہ خاتون نے ۹ جولائی ۷۵ء اور ۲۶
ستمبر ۷۵ء کو دوبارہ کانفرنس کے سلسلے میں خطوط لکھے اور دریافت کیا کہ آیا وہ کانفرنس
کے انتظامات کے سلسلے میں تعاون کرنا چاہتے ہیں اور کانفرنس کے اجلاس میں مقالے
پڑھنا چاہتے ہیں۔ باوجود دوبارہ یاددہانی کے خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی اور صرف
دو چار اساتذہ ہی نے تعاون کیا۔

جلسۂ افتتاحیہ اور جلسۂ اختتامیہ کے سلسلے میں ڈاکٹر آمنہ خاتون کافی
پریشان رہیں اور بڑی دوڑ دھوپ کی۔ ڈاکٹر نور الحسن وزیر تعلیم مصروف ہونے کی وجہ
سے نہ آسکے۔ ان دنوں وزیر اعلیٰ ڈی دیوراج ارس بھی مصروف تھے۔ وقت بہت کم
رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں ڈاکٹر صاحبہ مسز اندرا وائس چانسلر سے ملتی رہیں۔ بڑی تگ و دو
کے بعد آپ نے ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ کو خطبہ افتتاحیہ کے لئے آمادہ کرلیا۔ اور خطبہ
اختتامیہ کے لئے گورنر موصوف نے بھی اپنی رضامندی دیدی۔

آج ۲۵ اکتوبر ہے۔ کانفرنس کے شروع ہونے میں ایک دن باقی رہ گیا
ہے وہ مجھے سمجھا رہی ہیں کہ آج بس لے کر اسٹیشن جانا ہے میں وقت پر بس لے کر اسٹیشن
پہونچ جاؤں، مندوبین کو اسٹیشن سے فوراً یونیورسٹی کیمپس پہنچا دوں، دہلی ٹرین
کے بارے میں مجھے ہدایت دے رہی ہیں کہ اس ٹرین سے بہت سے مندوبین آرہے
ہیں۔ لہذا میں وقت پر بس لے کر اسٹیشن پہنچ جاؤں، انجمن کے عہدہ دار بھی اسی
ٹرین سے آرہے تھے۔ صبح مندوبین کو کیمپس چھوڑ کر میں رات کے دہلی ٹرین کے لئے
پہنچ گیا ہوں، ٹرین آنے میں چند منٹ باقی ہیں۔

دہلی ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ چکی ہے ڈاکٹر شبیہ الحسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب، اور دوسرے احباب اتر رہے ہیں۔ قلیوں کے سروں پر سامان لدوایا جا رہا ہے۔ سب مندوبین آکر بس میں بیٹھ چکے ہیں۔ مندوبین اور سامان سے بس لد گئی ہے تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے ہماری بس یونیورسٹی کیمپس پہنچتی ہے۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون کھڑی مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ ہر طرف سے "آمنہ باجی، آمنہ باجی" کی صدائیں آ رہی ہیں۔ کمروں میں مندوبین کا سامان رکھوایا جا رہا ہے بس ڈیفنس ہاسٹل سے جہاں مہمانوں کو ٹھہرایا گیا ہے مینس ہاسٹل کو چلتی ہے۔ سب بس سے اتر رہے ہیں۔ ڈائننگ ہال سے بھوک کی اشتہا بڑھانے والی خوشبو آ رہی ہے۔ سب مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ اور تعریفیں بھی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کھڑی جواب میں مسکرا رہی ہیں۔ کھانے کے بعد سب زنانہ ہاسٹل پہنچ گئے ہیں اور اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے ہیں۔ کیونکہ صبح کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہے۔ میں بس لئے سٹی لوٹ رہا ہوں تاکہ صبح اور مندوبین کو لے کر کیمپس پہنچوں۔

کانفرنس کی صبح میں بس میں مندوبین کو لئے کیمپس پہنچ رہا ہوں بس رکنے پر بس سے مندوبین اتر رہے ہیں۔ مندوبین اپنے دوستوں سے ملاقات کر رہے ہیں۔ اور اپنے دیر سے پہنچنے کی وجہ بتلا رہے ہیں۔

ہاسٹل میں کافی گڑبڑ ہے کچھ منہ ہاتھ دھو رہے ہیں، کچھ نہا رہے ہیں اور کچھ بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ کانفرنس آفس کے سامنے قطار بن رہی ہے اس روم میں ڈاکٹر شارب اور سینیر ایم اے کے دو مستعد طلبہ سید مشتاق احمد اور نور اللہ شریف کے ساتھ بیٹھے ہوئے آفس کے کام میں ہمہ تن مشغول ہیں۔ چند مندوبین سے فیس لی جا رہی ہے رسیدیں بھی چاک کی جا رہی ہیں۔ فائل اور کتابیں مندوبین کو دی جا رہی ہیں۔ سب ناشتے کے لئے نکل رہے ہیں، بس میں آ بیٹھے ہیں۔ بس ویمنس ہاسٹل سے مینس ہاسٹل جو صرف دو فرلانگ پر واقع ہے، کی جانب چل رہی ہے۔ لوگ ڈاکٹر آمنہ خاتون اور ان کے رفقا کی تعریف کر رہے ہیں کہ مندوبین کو دو قدم چلنے بھی نہیں دیا جا رہا ہے ہر دو قدم کے لئے بس چلتی ہے ناشتہ ہو رہا ہے، ناشتہ ختم ہوتے ہی لوگ پھر بس میں آ بیٹھے ہیں۔ اور بس سینیٹ ہال کی جانب رواں دواں ہے۔ بس سینیٹ ہال پر رکی ہے مندوبین بس سے اتر کر گیان بھارتی کے خوبصورت اور آرام دہ سینیٹ ہال میں داخل ہو رہے ہیں موسم بہار کی خوشگوار ہوائیں چل رہی ہیں۔ ڈاکٹر ڈی کے آر وی راؤ ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ برائے سماجی و اقتصادی تبدیلی بنگلور کا انتظار ہو رہا ہے۔ دیکھو وہ آ پہنچے، آتے ہی

وجہ تاخیر اور باعث تاخیر کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ پرانے کیمپس سنٹرل کالج سے ہوتے ہوئے آئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ستار ب، ڈاکٹر آمنہ خاتون اور صدر استقبالیہ ڈاکٹر ایچ نرسیمیا، وائس چانسلر انھیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ مہمان خصوصی کے ہمراہ انجمن کے عہدیدار سینیٹ ہال میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ جلسے کی کارروائی شروع ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر ایچ نرسیمیا خیر مقدمی تقریر کے لئے مائک پر تشریف لا رہے ہیں۔ ایک مختصر خوشگوار عرصے میں ان کی تقریر ختم ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس بڑے خوبصورت انداز میں رپورٹ پڑھ رہے ہیں۔ ان کی رپورٹ کے بعد ڈاکٹر راؤ تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور اردو کی حمایت میں بڑی پر اثر تقریر کر رہے ہیں۔ سب دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ انگریزی اور اردو اخبار کے صحافی تیزی سے نوٹ لے رہے ہیں۔ ان کی تقریر ختم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن خطبۂ صدارت کے لئے مائک پر تشریف لا رہے ہیں۔ اس کے بعد اس کانفرنس کی میر کارواں ڈاکٹر آمنہ خاتون معتمد استقبالیہ کمیٹی بڑے دلنشیں انداز میں شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی افتتاحیہ اجلاس ختم ہوا۔ سب لوٹ رہے ہیں۔ دوپہر میں پہلا اجلاس نصاب سازی کے مسائل پر ہونے والا ہے۔

دوپہر میں نصاب سازی کے مسائل پر پہلا اجلاس ہو رہا ہے۔ مقالے پڑھے جا رہے ہیں۔ مندوبین مباحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ مباحث کے بعد یہ اجلاس ختم ہو گیا ہے سینیٹ ہال سے مندوبین ہاسٹل لوٹ رہے ہیں۔ کچھ آ گئے جو سستا رہے ہیں۔ آٹھ بجے رات بسیں مندوبین کو لینے آ گئی ہیں۔ وزیر حمل و نقل جناب محمد علی صاحب نے مندوبین کو پر تکلف عشائیہ پر مدعو کیا ہے۔ مندوبین کو لے کر بسیں شہر کی شاہراہوں اور گلزاروں سے گذر رہی ہیں۔ قدرتی مناظر اور برقی قمقموں کی روشنیوں سے مندوبین لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لیجئے وزیر موصوف کی رہائش گاہ آ گئی ہے۔

مندوبین اتر رہے ہیں۔ وزیر موصوف مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

کھانے کا دور شروع ہو گیا ہے۔ ہمہ اقسام کے پکوان چنے گئے ہیں۔ سب کا کھانا ختم ہو چکا ہے۔ اور پھر سب بس میں آ بیٹھے ہیں۔ بس روانہ ہو گئی ہے۔ شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل اوڈلینس پر بسیں رکی ہیں۔ مندوبین چائے پینے کے لئے بسوں سے اتر رہے ہیں۔ شہر بنگلور اور یہاں کے ہوٹلوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ چائے پی کر سب بسوں میں آ بیٹھے ہیں اور بسیں ہیبل کے لئے روانہ ہو گئی ہیں۔

دوسری صبح بھی بےبراکنہ بیکو غیر اردو داں اصحاب کو اردو پڑھانے کے

مسائل پر اجلاس ہو رہا ہے۔ کوئی آٹھ مقالے اس اجلاس میں پڑھے گئے ہیں۔ اس اجلاس کے کنوینر کی حیثیت سے میں شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ اجلاس ختم ہو گیا۔ یہاں سے مندوبین [illegible] یونیورسٹی لائبریری آ گئے ہیں۔ یہاں یونیورسٹی اردو اساتذہ کی کتابوں کی نمائش ترتیب دی گئی ہے۔ آتے ہی [illegible] شروع ہو گئی۔ وائس چانسلر ڈاکٹر [illegible] نے نمائش کا افتتاح کیا ہے۔ وہ تقریر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نمائش کے ضمن میں [illegible] بتلا رہی ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس تقریر کر رہے ہیں۔ شکریہ کے لئے مجھے دوبارہ یاد کیا گیا ہے۔ میں شکریہ ادا کر چکا ہوں۔ اور محفل برخواست ہو گئی ہے۔

[illegible] لوگ۔ [illegible] رہے ہیں۔ یہاں کتابوں کی نمائش ترتیب دی گئی ہے۔ سب کتابیں دیکھ رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر آمنہ خاتون اور ان کے رفقا کی تعریف کر رہے ہیں کہ اچھی نمائش ترتیب دی ہے۔ یہاں کافی وقت ہو چکا ہے اس لئے تیسرا اجلاس کل کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ شام کی چائے پر گورنر صاحب نے مندوبین کو مدعو کیا ہے۔ دوپہر کے کھانے سے سب فارغ ہو کر تیار ہو رہے ہیں [illegible] راج بھون کے لئے روانہ ہو چکی ہے شہر [illegible] کے خوبصورت [illegible] سے مندوبین لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ [illegible] خوبصورت ہو چلا ہے۔

بس [illegible] راج بھون پہنچ چکی ہے۔ گورنر کے سکریٹری سب کو راج بھون کے نہایت ہی خوبصورت ہال میں بٹھا رہے ہیں۔ سب کی نظریں گورنر کو دیکھنے کی مشتاق ہیں جب سکریٹری نے دو بار [illegible] آواز لگائی کہ LADIES AND GENTLEMEN HERE IS THE GOVERNER تو سب کی نظریں گورنر کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اور سب کا سلام لیتے ہوئے ہال میں داخل ہو رہے ہیں۔ سب کا تعارف [illegible] سب سے ملاقات کر کے وہ اپنی جگہ آ بیٹھے ہیں [illegible] شروع ہو رہے [illegible] جائے کی جب یہاں [illegible] فارغ ہو کر سب [illegible] بیٹھے ہیں [illegible] یونیورسٹی کیمپس [illegible]

آج [illegible] کا آخری دن [illegible] ۲۵ [illegible] ہے۔ آج دو اجلاس [illegible] اجلاس شروع ہو [illegible] جا رہے ہیں [illegible] ہو رہے ہیں

شکریہ کے لئے انیس الحق صاحب کنوینر اجلاس کھڑے ہوئے ہیں وہ شکریہ ادا کر چکے ہیں۔ اس کے فوری بعد آخری اجلاس شروع ہو گیا ہے۔ اردو روزگار کے مسائل پر مقالے پیش کئے جا رہے ہیں۔ مباحث ہو رہے ہیں، اور شکریہ کے لئے محترمہ وحید النساء کھڑی ہو گئی ہیں۔ وہ شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ یہ اجلاس بھی ختم ہو چلا ہے۔

جناب صدیق الرحمن قدوائی کی نگرانی میں نئے عہدیداروں کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ اس بار ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس کو مندوبین نے اتفاق آراء سے صدر اور معتمد نامزد کیا ہے۔ اور یہ ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے کہ وہ دوسرے عہدیداروں کو نامزد کریں۔ نئے عہدیداروں کا اعلان ہو چکا ہے۔ ہم سب لوٹ رہے ہیں۔ شام اختتامی اجلاس ہونے والا ہے۔

شام ۶ بجے اختتامی اجلاس میں خطبہ اختتامیہ دینے کے لئے گورنر شری موہن لال سکھاڈیا تشریف لا چکے ہیں۔ عہدیداران کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اختتامی اجلاس شروع ہو گیا ہے۔ گورنر موصوف اردو کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ وہ بتلا رہے ہیں کہ جنگ آزادی میں اردو نے کیا رول ادا کیا ہے۔ آخر میں موصوف یقین دلا رہے ہیں کہ وہ ریاست میں اردو کے فروغ کے لیے ممکنہ کوشش کریں گے۔ اس کے بعد وائس چانسلر تقریر کر رہے ہیں۔ کچھ دیر میں ان کی تقریر ختم ہو چکی ہے۔ اب ڈاکٹر قمر رئیس شاعرانہ انداز میں بڑی حسن و خوبی کے ساتھ شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ سب قمر رئیس کے شکریہ کی تعریف کر رہے ہیں۔

مندوبین زنانہ ہاسٹل روانہ ہو گئے۔ رات اساتذہ اردو جامعات ہند کا مشاعرہ ٹاؤن ہال میں مقرر ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ، شعراء حضرات اور مندوبین سے اس سلسلے میں بات کر رہی ہیں۔

رات آٹھ بجے ڈاکٹر آمنہ خاتون مندوبین کے ساتھ ٹاؤن ہال پہنچی ہیں۔ مہتمم مشاعرہ مولوی محمد خان صاحب مندوبین کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اساتذہ اردو جامعات ہند کی سوانح حیات پر مبنی سووینر شائع ہو چکا ہے۔ مولوی محمد خان صاحب مندوبین کو سووینر تقسیم کر رہے ہیں۔

قرأت کلام پاک سے مشاعرے کی کارروائی کا آغاز ہوا ہے۔ مشاعرہ شروع ہو گیا ہے بڑی حسن و خوبی سے کنول قریشی مشاعرہ چلا رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک شاعر تشریف لا رہے ہیں۔ داد و تحسین سے ہال گونج رہا ہے۔ رات تقریباً ایک بجے مشاعرہ ختم ہوا ہے۔ مندوبین لوٹ رہے ہیں۔ صبح انھیں بلسوڑا و بینڈا

[illegible] ڈن کے لئے نکلنا ہے۔ اس [illegible] انتظام ٹرانسپورٹ منسٹر جناب محمد علی صاحب نے کیا ہے۔ ان کے بھائی ڈاکٹر ہاشم علی مندوبین کی اس سلسلے میں مدد کر رہے ہیں۔

صبح بسیں میسور کے لئے نکل رہی ہیں۔ اس سے قبل سب کا ناشتہ صفیہ جیرت صاحبہ کے گھر پر ہو رہا ہے۔ ناشتے کے بعد بسیں باغ کے لئے روانہ ہو رہی ہیں۔ بسیں [illegible] باغ پہنچ گئی ہیں [illegible] مندوبین لال باغ دیکھ رہے ہیں۔ لال باغ میں ایک سانپ کا جوڑا مرا پڑا ہے۔ [illegible] اس جوڑے کو دیکھ کر گرہ لگائی ہے چلئے شاعری کا دور شروع ہو گیا ہے۔ سب اس پر شعر کہہ رہے ہیں۔ بسیں میسور کے لئے روانہ ہو چکی ہیں۔ لیکن ابھی تک سانپ کا جوڑا موضوع سخن ہے اور اس پر شعر کہے جا رہے ہیں [illegible] چائے کے لئے بسیں رکی ہیں۔ تب کہیں جا کر موضوع سخن بدلا ہے۔ چائے کے بعد پھر بسیں روانہ ہو چکی ہیں۔ اب ریختی کا دور شروع ہوا ہے۔ ڈاکٹر قمر [illegible] ریختی سنا رہے ہیں۔ شہاب جعفری بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میسور کی سیاحت اور [illegible] گارڈن دیکھنے کے بعد مندوبین رات ایک بجے بسیں لوٹ رہے ہیں۔ صبح انھیں اپنی اپنی منزلوں کی طرف نکلنا ہے۔ بس سے اتر کر سب اپنے اپنے کمروں میں پہنچ گئے ہیں۔ سامان باندھ رہے ہیں کیونکہ علی الصباح نکلیں، صبح سات بجے ٹرین ہے۔

صبح کے ۶ بجے ہیں اور مندوبین لوٹ رہے ہیں۔ اکثر بڑی حسرت سے احباب کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ پتہ نہیں پھر کب ملیں۔ خوشی خوشی سب آئے تھے اب بجھے بجھے لوٹ رہے ہیں۔ انھیں بنگلور چھوڑنے کا غم ہے۔ بس اسٹیشن کی جانب رواں دواں ہے۔ کانفرنس کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ حسن انتظام کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے جو پر تکلف اور لذیذ کھانے کھلائے ان کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ اسٹیشن آ گیا ہے۔ سب پلیٹ فارم پر آ رہے ہیں [illegible] ٹرین میں بیٹھ گئے ہیں ٹرین بھی اسٹیشن سے [illegible] مندوبین کو . . .

[illegible] ریلوے اسٹیشن [illegible] ہم لوگ اتر گئے ہیں [illegible] مندوبین [illegible] سے لوٹ رہے ہیں [illegible]

اساتذۂ اردو کی بنگلور کانفرنس

انجمن اساتذۂ اردو کی چھٹی کل ہند کانفرنس بنگلور یونیورسٹی کے زیر اہتمام اس کے نئے خوبصورت کیمپس گیان بھارتی میں ۲۶ تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں آندھرا، بہار، یوپی، مدھیہ پردیش، جموں، کشمیر، ہماچل پردیش، مہاراشٹر، گجرات، تامل ناڈو، کیرالا، راجستھان، اڑیسہ، دہلی، کرناٹک اور بعض دوسرے علاقوں کی چوبیس یونیورسٹیوں کے سو سے زائد مندوبین نے حصہ لیا۔

۲۶ اکتوبر کے افتتاحی اجلاس میں بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر نرسمہیا نے جو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے مندوبین اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ کانفرنس کا افتتاح سابق وزیر تعلیم حکومت ہند جناب ڈاکٹر مسٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے کیا۔ ڈاکٹر راؤ نے اپنے خطبے میں ملک میں اردو کی اہمیت، ہمہ گیری، اور اس کی ترقی کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ کسی ایک علاقہ کی زبان نہیں بلکہ ملک کے بیشتر علاقوں میں بولی اور سمجھی جانے والی ایک محبوب اور مقبول زبان ہے۔ ملک میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے انھوں نے کئی تجاویز پیش کیں اور کہا کہ جدید سماجی اور سائنسی علوم سے بہرہ ور ہوئے بغیر اردو کی بقا اور ترقی کا تصور ممکن نہیں۔ ڈاکٹر راؤ نے اپنے دہلی کے زمانہ قیام کو یاد کرتے ہوئے ان کوششوں کا ذکر کیا جو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اور ترقی اردو بورڈ کی تشکیل و تعمیر میں انھوں نے کی تھیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اساتذہ اور اہل علم تکنیکی اور سائنسی علوم سے متعلق ایسی کتابیں تیار کریں جو یونیورسٹیوں سے باہر عام اردو داں پڑھ سکیں۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ اردو کے ساتھ ایک علاقائی زبان اور ہندی کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ صدر انجمن پروفیسر محمد حسن نے اپنے خطبے میں ملک میں اردو زبان و ادب کی تعلیم کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور اس سلسلے میں بعض اہم مسائل پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی تعلیم کا بڑا مسئلہ عالمی معیاروں تک رسائی حاصل کرنا ہے اور اردو کے طلبہ میں جدید عقلی اور سائنسی مزاج کی تربیت کرنا ہے۔

قمر رئیس (جنرل سکریٹری) نے اپنی رپورٹ میں انجمن اساتذۂ اردو کی سرگرمیوں اور ان مشکلات کا ذکر کیا جو اپنے مقاصد کے حصول میں اسے پیش آ رہی ہیں۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کنوینر مجلس استقبالیہ نے مندوبین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کانفرنس کے چار اجلاس تین روز تک چار اہم موضوعات پر مذاکروں کی شکل میں ہوئے، جن میں مندوبین نے بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا۔ پہلے اجلاس میں جس کا موضوع نصاب تھا۔ ضمیر حسن دہلوی، عبدالودود (بھوپال) ابوذر عثمانی (رانچی)، ش۔ اختر (رانچی) اور عتیق احمد صدیقی (علیگڑھ) نے مقالے پڑھے۔ انھوں نے اردو کے موجودہ نصابات اور طریق تعلیم میں تبدیلیوں اور تشکیل نو پر زور دیا۔ بحث میں وہاب اشرفی، شارب ردولوی، ڈاکٹر رضی الدین محمد، انیس الحق اور ڈاکٹر حسرت سہروردی نے حصہ لیا۔

دوسرے اجلاس کا موضوع غیر اردو داں طلبہ کو اردو پڑھانے کے مسائل تھا۔ اس اجلاس میں سید محمد حسنین (بہار)، حسرت سہروردی (تریچناپلی) اطہر پرویز (علیگڑھ) عزیز احمد جاوید (رانچی) حامد تیجپوری (بہار)، عشرت الرحمن (ناگپور)، قمر رئیس (دہلی) اور ہارون ایوب (ہماچل) نے مقالے پڑھے، ان مقالوں میں غیر اردو داں ہندوستانی اور غیر ملکی طلبہ کو اردو پڑھانے کی مشکلات، مسائل اور ان کے حل کی طرف اشارے کیے گئے تھے۔ بحث میں پروفیسر شبیہ الحسن، پروفیسر گوریکر، پروفیسر محمد حسن، ابوذر عثمانی، حسنین شاہد، جعفر رضا، شہاب جعفری، خلیل اللہ محی الدین اور انیس الحق نے حصہ لیا۔ شرکائے بحث نے اس پر زور دیا کہ اردو سکھانے کے لئے اس کے موجودہ رسم الخط میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ اس طرح کی کوئی تجویز قابل قبول نہیں ہوگی۔ حسنین شاہد نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ سب سے زیادہ ضرورت اردو گھرانوں کے ان بچوں کو اردو سکھانے کی ہے۔ جو گذشتہ ربع صدی میں اردو کی تعلیم سے محروم رہے۔

۲۷ اکتوبر کے اس اجلاس میں بحث اتنی دلچسپ اور جاندار رہی کہ اردو تحقیق کی رفتار اور مسائل والا مذاکرہ جو اسی دن ہونا تھا دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

۲۸ اکتوبر کی صبح کو اردو تحقیق اور اردو کی تعلیم اور روزگار کے مسائل پر دو اہم اجلاس ہوئے۔ ان میں محمد ہاشم علی (میسور) اخلاق اثر (بھوپال) تنویر احمد علوی (دہلی) نجم الہدیٰ (مظفرپور) آنندو (کشمیر) منظر عباس (علیگڑھ) صدیق الرحمن قدوائی (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کے مقالوں کے علاوہ عنوان چشتی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) شارب ردولوی، عبدالحق، شریف احمد، حنیف کیفی (دہلی) اور اطہر پرویز (علیگڑھ) وہاب اشرفی

نے بحث میں حصہ لیا۔ ان کے علاوہ دوسرے مندوبین نے بھی مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ان اجلاسوں کے مباحثے کے نتیجے میں بہت سی تجاویز سامنے آئیں جو آخری اجلاس میں پیش ہوئیں۔

کانفرنس میں بہت سی اہم قراردادیں منظور ہوئیں، جو حسب ذیل ہیں۔

قرارداد نمبر ۱۔ انجمن اساتذۂ اردو کا یہ اجلاس ملک کی بدلتی ہوئی خوشگوار فضا کے پیش نظر حکومت ہند سے درخواست کرتا ہے کہ اردو کو ملک میں اس کا جائز مقام دیا جائے۔ یہ اجلاس صدر جمہوریہ ہند سے گذارش کرتا ہے کہ وہ دستور ہند کے تحت اپنے اختیارات خصوصی کو کام میں لاتے ہوئے ایک آرڈیننس جاری کریں جس کے ذریعہ یوپی، بہار، آندھرا پردیش، راجستھان، ہماچل پردیش، ہریانہ، دہلی میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

قرارداد نمبر ۲۔ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کا یہ اجلاس این سی ای آر ٹی اور ترقی اردو بورڈ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مختلف درجات کے لئے ایک مستقل شعبہ قائم کریں تاکہ تعلیمی تجربات کی روشنی میں ان اضافات پر بار بار نظر ثانی کی جاتی رہے اور حسب ضرورت ان میں مناسب ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا رہے۔

قرارداد نمبر ۳۔ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کا یہ اجلاس اتر پردیش کی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان اردو اساتذہ کی تربیت کے لئے جن کا حال میں مختلف سطحوں پر تقرر کیا گیا ہے کم مدت کا ایک تربیتی پروگرام شروع کیا جائے تاکہ وہ کم مدت میں مناسب تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔ اور ان کو عملی تربیت بھی مل جائے۔

قرارداد نمبر ۴۔ انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ ملک کی ایسی تمام یونیورسٹیوں میں جہاں اردو کی مختلف جگہیں خالی پڑی ہیں تقررات کئے جائیں اور جگہیں پر کی جائیں۔

(۱) جن یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے دوسرے شعبوں سے ملا دیئے گئے ہیں وہاں اردو کے شعبے الگ کر دیئے جائیں۔

(۲) ایسے تمام شعبوں میں کم از کم ایک پروفیسر، ایک ریڈر اور اردو لیکچراروں کا تقرر کیا جائے اور ایک مستقل شعبے کی تشکیل کی جائے۔

(۳) جن یونیورسٹیوں میں ابھی تک اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام نہیں ہے ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہاں جلد از جلد اردو کے شعبے کھولے جائیں اور مناسب

تقرریاں کئے جائیں۔

قرارداد نمبر ۴: انجمن اساتذہ اردو کا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ ریاستی اور مرکزی حکومت کے ان اداروں میں جو اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے قائم ہیں انجمن کے کم از کم ایک نمائندے کی جگہ مخصوص کی جائے۔

قرارداد نمبر ۵: انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کا یہ جلسہ محترمہ اندرا گاندھی کے مجوزہ بیس نکاتی پروگرام کی مکمل تائید کرتا ہے اور انھیں بھرپور تعاون کا یقین دلاتا ہے۔

قرارداد نمبر ۶: انجمن اساتذہ اردو کا یہ جلسہ ترقی اردو بورڈ کی مطبوعات کی قیمتوں کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتا ہے نہ صرف یہ کہ زیادہ قیمتوں کی وجہ سے اردو کے طلبہ اور اساتذہ ان کتابوں کو خرید نہیں سکتے بلکہ اکثر کالجوں کے اردو شعبوں اور کتب خانوں کو لائبریوں کی خرید کے لئے جو رقم ملتی ہے وہ بھی اتنی نہیں ہوتی کہ ترقی اردو بورڈ کی مطبوعات کا ایک سیٹ خریدا جا سکے۔ اس طرح بیشتر طلبہ اہل اردو اور اردو اساتذہ ترقی اردو بورڈ کی مفید اور معیاری کتابوں کے مطالعے سے محروم رہتے ہیں۔ اس صورت میں انجمن اساتذہ اردو کا یہ اجلاس وزیر تعلیم حکومت ہند اور چیرمین ترقی اردو بورڈ سے مطالبہ کرتا ہے کہ

(۱) ترقی اردو بورڈ کی درسی اور غیر درسی کتابوں کی قیمتوں میں کم سے کم پچاس فیصد کمی کی جائے۔

(۲) دانش گاہوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو بورڈ کی مطبوعات فراہم کی جائیں۔

(۳) ترقی اردو بورڈ کے اشتراک اور تعاون سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمتوں میں بھی کمی کی جائے۔

قرارداد نمبر ۷: انجمن اساتذہ اردو کا یہ اجلاس کیرلا کی حکومت سے اپیل کرتا ہے کہ کالی کٹ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی منظور شدہ قرارداد "کہ کالی کٹ یونیورسٹی میں ایک اردو چیر قائم کی جائے" کو بہت جلد عمل میں لایا جائے۔

قرارداد نمبر ۸: انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کا یہ جلسہ مدھیہ پردیش، دہلی، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں اردو اکیڈمی کے قیام کا خیر مقدم کرتا ہے اور اپیل کرتا ہے کہ متعلقہ حکومتیں جلد سے جلد اعلان کو عملی شکل دیں۔ بہار، گجرات، کیرلا کی حکومتوں سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان ریاستوں میں اردو کی کثیر آبادی کے پیش نظر اردو اکیڈمی قائم کریں۔

قرارداد نمبر ۹ :- انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کا یہ جلسہ محسوس کرتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف دانش گاہوں کے اردو شعبوں میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اس میں باہمی طور پر کوئی تال میل نہیں ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ انجمن اساتذہ اردو تحقیقی کام کی ایک منصوبہ بندی کمیٹی تشکیل دے جو تحقیقی کام کے بارے میں حقائق جمع کر کے متعلقہ مسائل پر غور و فکر کرے اور آئندہ اجلاس میں ایک جامع رپورٹ پیش کرے۔ صدر انجمن کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ کمیٹی کے اراکین کو نامزد کریں۔

قرارداد نمبر ۱۰ :- سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز نے سولن (ہماچل پردیش) میں اردو ریسرچ اور ٹریننگ کا ایک مرکز ۱۹۷۰ء میں کھولا تھا کہ وہ اساتذہ کو اردو تدریس کی تربیت دی جائے اور وہاں کے اسکولوں کے لئے نصابی کتابیں تیار کی جائیں لیکن انتظامیہ کی کوتاہی کے باعث آج تک اس مرکز کے پرنسپل کا تقرر عمل میں نہیں آیا۔ نہ ہی دیگر اساتذہ کا جو اس سنٹر کے لئے منظور کئے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس مرکز کی کارکردگی ختم ہوتی جا رہی ہے اور اب یہ تجویز کیا جانے لگا ہے کہ اس مرکز کو پٹیالہ مرکز کے ساتھ مدغم کر دیا جائے۔ اساتذہ اردو کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ یہ اردو کے ساتھ سراسر ناانصافی ہوگی۔ اس لئے یہ جلسہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے ڈائرکٹر اور وزارت حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ (۱) سولن کے مرکز کو برقرار رکھا جائے، اور (۲) وہاں پرنسپل اور دیگر اساتذہ کا فوراً تقرر کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۱۱ :- انجمن اساتذہ اردو کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ چونکہ گلبرگہ صدیوں سے اردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے اور آج بھی وہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کم و بیش ... لہٰذا یہ ضروری ہے اس لئے کرناٹک یونیورسٹی گلبرگہ میں اردو کے اعلیٰ تعلیم کے خواہاں نوجوانوں کے لئے ایک پوسٹ گریجویٹ سنٹر قائم کرے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ ذریعہ تعلیم کرناٹک نے دو سال قبل بنگلور یونیورسٹی اور کرناٹک یونیورسٹی میں اردو ریڈر و پروفیسر کے تقرر کا جو اعلان اور وعدہ کیا تھا اسے جلد سے جلد پورا کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۱۲ :- انجمن کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ انجمن کا سالانہ چندہ پانچ روپے کی بجائے دس روپیہ کر دیا جائے۔ یہ اجلاس ملک میں انجمن کی بڑھتی سرگرمیوں کے پیش طے کرتا ہے کہ انجمن کے تین نائب صدر اور تین جوائنٹ سکریٹری

ہوں، اس کے مطابق یہ اجلاس انجمن کے دستور العمل میں ضروری تبدیلی کو منظور کرتا ہے۔

(ماخوذ از ہماری زبان)

کانفرنس کے آخری اجلاس کو کرناٹکا کے گورنر جناب موہن لال سکھاڈیہ نے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہمارے ملک میں مشترکہ تہذیب اور قومی اتحاد کی علامت رہی ہے۔ آزادی اور سماجی ترقی کی جدوجہد میں اس زبان نے اہم رول ادا کیا ہے اس کے علاوہ دفتری نظام اور کاروبار میں بھی اس کا چلن رہا ہے، چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے یقین دلایا کہ کرناٹکا کی یونیورسٹیوں میں اردو اساتذہ کے تقرر اور اردو شعبوں کے قیام میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

انھوں نے انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی کل ہند کانفرنس کے اختتامی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو نے زندگی کے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ اردو کی ہمہ گیری نے دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اسے مقبول عام بنا دیا ہے۔ اردو مسجد و میخانہ، جنگ و امن اور آشتی کی زبان ہے ہم نے اپنے ملک کی آزادی کی لڑائی میں اس زبان سے ولولے حاصل کیے ہیں۔ اس لئے ہم اسے کسی صوبے، مذہب یا ذات پات سے وابستہ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مکمل زبان وہی کہلائی جا سکتی ہے جس میں جذبات و احساسات کے اظہار کی پوری طاقت ہو اور یہ اصول اردو زبان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ گورنر کرناٹکا نے اپنے اس تاثر کا اظہار کیا کہ کسی زبان کو دبایا نہیں جا سکتا ہے جن ملکوں میں زبانوں کو دبانے کی کوشش کی گئی وہاں انقلاب رونما ہو گئے۔ اور ان ممالک کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس قسم کی مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبانوں کے بارے میں ہماری پالیسی فراخدلانہ ہونی چاہیئے، لسانی منافرت سے ملک کے اتحاد کو نقصان پہنچے گا۔

مسٹر سکھاڈیہ نے اردو اساتذہ کی اس کانفرنس میں نہایت شستہ زبانوں میں تقریر کی۔ انھوں نے اردو داں طبقہ پر زور دیا کہ وہ سیاست سے زبان کو دور ہی رکھیں۔ انھوں نے مختلف ریاستوں میں اردو اکیڈمیوں کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات اردو اور اردو والوں کے مسائل کی یکسوئی کے لئے ایک خوش آیند علامت ہے۔ انھوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ ریاستی حکومت اردو کے مسائل میں ہر طرح کا تعاون دینے کی کوشاں ہے۔ یہ سہ روزہ کانفرنس

۱۰ نومبر کو کئی یان بھارتی بنگلور یونیورسٹی میں اختتام پذیر ہوئی۔

اختتامی اجلاس میں وائس چانسلر بنگلور یونیورسٹی مسٹر ایچ نرسیمیا نے مبارکباد دی۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون صدر شعبہ اردو نے انجمن اساتذہ کے مقاصد اور کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد حسن صدر انجمن نے کانفرنس میں منظور شدہ قراردادوں کی وضاحت کرتے ہوئے حکومت سے اپیل کی کہ اردو کے جائز حقوق کی عمل آوری میں کوئی کوتاہی نہ برتی جائے۔ ڈاکٹر قمر رئیس جنرل سکریٹری نے شعری پیرائے میں شکریہ ادا کیا۔

کانفرنس میں انجمن کے نئے عہدیداروں کا تقرر بھی عمل میں آیا۔ صدر اور جنرل سکریٹری کے عہدوں کے لئے مندوبین نے متفقہ رائے سے پروفیسر محمد حسن اور قمر رئیس کو دوبارہ منتخب کیا۔ ان کے علاوہ تین نائب صدر ڈاکٹر آمنہ خاتون، ڈاکٹر حسینی شاہد اور قاضی عبدالستار منتخب کئے گئے۔ جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ظہیر راہی، ڈاکٹر فصیح ظفر اور شیام لال کالڑا (عابد پشاوری) کا انتخاب عمل میں آیا۔ انجمن کے نئے خازن ستونراش (جاوید وششٹ) چنے گئے۔ آفس سکریٹری کی حیثیت سے صدر اور سکریٹری نے ڈاکٹر عبدالحق کو نامزد کیا۔ ان کے علاوہ مجلس عاملہ کے اراکین بھی منتخب ہوئے۔

ارض دکن (بنگلور) میں آمنہ خاتون اور ان کے رفقاء کے حسن انتظام اور ان کی دن رات کی تگ و دو کے نتیجے میں کامیاب ہونے والی اردو اساتذہ کی یہ کانفرنس ہمیشہ یادگار رہے گی۔

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند

کی

چھٹی کل ہند کانفرنس بنگلور منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۷۵ء

میں

شرکت کرنے والے مندوبین کے اسمائے گرامی

۱۔	مرزا محمد زماں آزردہ۔	جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر
۲۔	ڈاکٹر محمد حسن۔	صدر شعبۂ اردو جواہرلال نہرو یونیورسٹی دہلی
۳۔	بیگم محمد حسن۔	دہلی
۴۔	محمد عثمان ٹوپن کنٹی۔	کرناٹک یونیورسٹی بلگام
۵۔	ثاقب رضوی۔	اودے پور یونیورسٹی
۶۔	عبد الاحد۔	نلگنڈہ، عثمانیہ یونیورسٹی
۷۔	خلیل اللہ۔	مرہٹواڑہ یونیورسٹی
۸۔	مشتاق احمد۔	میسور یونیورسٹی میسور
۹۔	ظل حسنین۔	الہ آباد یونیورسٹی
۱۰۔	سید منظور احمد	جے پور
۱۱۔	عزیز احمد ٹاٹا کالج۔	چائباسہ رانچی یونیورسٹی
۱۲۔	شیخ حسین۔	یادگیر گلبرگہ، کرناٹک
۱۳۔	حشر سہروردی۔	ترچناپلی
۱۴۔	بیگم حشر سہروردی۔	ترچناپلی
۱۵۔	اصغر عباس۔	علی گڑھ یونیورسٹی
۱۶۔	شہاب جعفری۔	خالصہ کالج دہلی
۱۷۔	ڈاکٹر جعفر رضا۔	الہ آباد یونیورسٹی
۱۸۔	خواجہ نظام الدین۔	اتکل یونیورسٹی
۱۹۔	شاہ حسین نہری۔	مرہٹواڑہ یونیورسٹی

۲۰۔	حمید سہروردی	مرہٹواڑہ یونیورسٹی
۲۱۔	ڈاکٹر افصح ظفر	گڈھ یونیورسٹی
۲۲۔	بیگم افصح ظفر	گڈھ یونیورسٹی
۲۳۔	وہاب اشرفی	مگدھ یونیورسٹی
۲۴۔	محمد حامد چھپروی	بہار یونیورسٹی، مظفر پور
۲۵۔	صفیہ حیدر	طلباء تحقیق میسور یونیورسٹی
۲۶۔	ڈاکٹر شارب ردولوی	دہلی یونیورسٹی
۲۷۔	ڈاکٹر قمر رئیس	دہلی یونیورسٹی
۲۸۔	ڈاکٹر رضی الدین احمد	تروپتی، وینکٹیشورا یونیورسٹی
۲۹۔	منشاء الرحمن خان	ناگپور
۳۰۔	ڈاکٹر حسینی شاہد	پرنسپل اردو آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
۳۱۔	ڈاکٹر اخلاق اثر	بھوپال
۳۲۔	ڈاکٹر ذکیہ انجم	ماتا سندری کالج دہلی۔
۳۳۔	عریضی بیگم	احمد آباد، گجرات
۳۴۔	ایس ایس قادری بیگم	احمد آباد گجرات
۳۵۔	اقبال احمد ریاض	مدراس یونیورسٹی
۳۶۔	ڈاکٹر شبیہ الحسن	صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی
۳۷۔	عابد کرہانی	ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی
۳۸۔	قیصر شمیم	ریسرچ اسکالر 〃
۳۹۔	مسعود اقبال	〃 〃
۴۰۔	غلام جیلانی	〃 〃
۴۱۔	ڈاکٹر اطہر پرویز	علی گڑھ یونیورسٹی
۴۲۔	ڈاکٹر عبد الحق	دہلی یونیورسٹی
۴۳۔	محمد حنیف کلیم	میسور یونیورسٹی
۴۴۔	ڈاکٹر بشیر علی	میسور یونیورسٹی
۴۵۔	میر سراج الدین	ٹمکور میسور یونیورسٹی
۴۶۔	عبد الغفار شاکر	مدورائی
۴۷۔	منظر عباس نقوی	علی گڑھ

۴۸۔	تنویر احمد علوی	دہلی
	صدیق الرحمٰن قدوائی	جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی
۵۰۔	نورجہاں ثروت	دہلی
۵۱۔	احمد شریف	ممسکور میسور یونیورسٹی
۵۲۔	جاوید وششٹ	دہلی یونیورسٹی
۵۳۔	شریف احمد	دہلی یونیورسٹی
۵۴۔	اے ایل۔ اعزازی	دہلی یونیورسٹی
۵۵۔	لطیف محمد کامل قریشی	کروڑی مل کالج دہلی
۵۶۔	ڈاکٹر منظر اعظمی	جموں
۵۷۔	ایس۔ ایل کالڑا	جموں
۵۸۔	ظہور الدین	جموں
۵۹۔	اظہر راہی	اجین
۶۰۔	وسیم الدین	جاورہ
۶۱۔	ڈاکٹر عبدالودود	سیہورہ بھوپال
۶۲۔	بن ایس گوریکر	بمبئی
۶۳۔	عبدالمتین	جبل پور
۶۴۔	سید مہذب حسن	دہلی کالج
۶۵۔	یم حنیف کیفی	جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
۶۶۔	ڈاکٹر عنوان چشتی	جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
۶۷۔	ارشد جمال	
۶۸۔	ڈاکٹر زرینہ ثانی	ناگپور
۶۹۔	محمد حسین یم شیخ	گجرات یونیورسٹی احمد آباد
۷۰۔	محی الدین بمبئی والا	احمد آباد
۷۱۔	قاضی عبدالستار	علی گڈھ
۷۲۔	ڈاکٹر ایوب ہاردن	سولن، ہماچل پردیش
۷۳۔	ڈاکٹر رش. اختر	بہار
۷۴۔	ابوذر عثمانی رانچی	بہار
۷۵۔	ڈاکٹر محمد حسنین	صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی
۷۶۔	بیگم محمد حسنین	بہار

۷۷۔	عزیز احمد	ٹاٹا کالج رانچی یونیورسٹی بہار۔
۷۸۔	محمود خاور	حیدرآباد
۷۹۔	عابد صدیقی	حیدرآباد
۸۰۔	ڈاکٹر کمار	ترقی اردو بورڈ دہلی
۸۱۔	وحیدالنساء	مہارانی کالج بنگلور
۸۲۔	قدیر امتیاز	سینٹ جوزف کالج بنگلور
۸۳۔	میر جعفر علی	الامین کالج بنگلور
۸۴	عبدالکریم	الامین کالج بنگلور
۸۵۔	ریاض احمد	الامین کالج بنگلور
۸۶۔	محمد ابراہیم	گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور
۸۷۔	انیس الحق	آچاریہ پاٹھ شالہ کالج بنگلور
۸۸۔	ڈاکٹر نسیمہ بیگم	شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی
۸۹۔	رافعہ سعادت	دیانند کالج بنگلور
۹۰۔	عابدہ بیگم	حسنات کالج بنگلور
۹۱۔	انیس بیگم	میسور
۹۲۔	ڈاکٹر محمد طیب ابدالی۔	علیگڑھ یونیورسٹی
۹۳۔	نجم الہدیٰ	بہار

ص ۸۰ کا بقیہ

نظموں سے اوجھل تھا۔ جسٹ مل، ورند، گردھر، دیارام، گوال، ستیبل داس وغیرہ کے کلام کو اردو نہ کہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ان شاعروں نے تلفظ کی صحت کا بھی خیال رکھا ہے اور کہیں کہیں اصل تلفظ میں کچھ تبدیلی بھی کی ہے۔ ایسے ہم عوامی اردو کا نام دے سکتے ہیں کچھ اشعار دیکھئے ؎

ناگری داس کا شعر ہے ؎

عشق الہی کی جھلک ہے جیون سندر جھوپ
جہاں عشق تہاں آپ ہیں تادر نادر روپ

بقیہ صفحہ نمبر ۱۳۵ پر

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم لکچرر شعبۂ اردو بنگلور یونیورسٹی

نمائش کتب، اساتذۂ اردو جامعات ہند

اساتذۂ اردو جامعات کی چھٹی کل ہند کانفرنس کے سلسلہ میں کانفرنس کی کنوینر ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ اور دیگر اساتذہ نے فیصلہ کیا کہ استادوں کی کتابوں کی نمائش کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔

میں نے انتظام کی ذمہ داری قبول کرلی، اور کتابوں کی جمع بنگلور یونیورسٹی کے کتب خانے سے شروع کردی۔ یہاں بہت سی کتابیں نکل آئیں مگر دستیاب شدہ کتابوں سے فہرست زیادہ لمبی تھی۔

لہٰذا دوسرے کتب خانوں مسلم لائبریری، کتب خانہ ڈاکٹر آمنہ خاتون میرا اپنا کتب خانہ، اردو لائبریری اسنٹر، ہمدرد بکڈپو، اور دیگر کتب خانوں سے بھی کتابیں فراہم کی گئیں۔ ان تمام کتب خانوں اور دفتروں سے تقریباً ایک ہزار کتابیں ستر اسی رسالے، اور کئی قدیم اخبار جمع ہو گئے

ہمارے اس کتابی سرمایہ کی نمائش دو حصوں میں کی گئی۔

(۱) صرف استادوں کی کتابیں۔

(۲) کرناٹک میں اردو

(۳) ترقی اردو بورڈ کی کتابیں نمائش کا تیسرا حصہ رہیں جو انہوں نے اپنے ساتھ لائی تھیں۔

۱۔ استادوں کی کتابوں کو حسب ذیل سے طریقہ سے تقسیم کیا گیا۔

۱۔ نظم۔ ۲۔ نثر ۳۔ تنقید ۴۔ فکشن اور ڈرامہ۔ ۵۔ تاریخ وادب، اردو۔ ۶۔ لسانیات، قواعد لغات وغیرہ۔

ہر حصہ کی کتابوں کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ تصنیف / تخلیق

۲۔ تالیف / ترتیب / تدوین وغیرہ

مذکورہ بالا طریقہ پر استادوں کی کتابوں کو تقسیم کرنے کے بعد ہماری برادری کی کتابوں کے چھپ شدہ ذخیرے سے جو خوشی ہوئی تھی اس میں کمی ہونے

تھی اس لیے سوائے تنقید، لسانیات، اور کسی حد تک نظم کے باقی حصوں میں استادوں کی تخلیقات بہت کم یا بالکل موجود نہیں ہیں۔ کتنے استاد ڈرامہ نگار، ناول نویس، قواعد نویس، اور مورخ نکلے۔

اپنے خیال میں بھی اس کے متعدد سبب ہو سکتے ہیں۔

ہماری برادری محنت سے جی چرانے والی اور آرام طلب ذہن آسان ہے یا ہمارا تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہے۔ دوسری وجہ کچھ قابل یقین نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے تنقیدی سرمایہ کا ڈھیر موجود ہے۔ مگر یہاں بھی اصول تنقید، تاریخ تنقید، فن تنقید کی کتابیں تسلی بخش نہیں ہیں۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہی ایک میدان ایسا ہے جس میں استاد نقاد زیادہ اور غیر استاد نقاد بہت کم نظر آتے ہیں۔ مگر فکشن کا میدان اس کے بالکل برعکس ہے۔

داستانیں، ناول وغیرہ میں قدیم استادوں میں مولوی نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسوا، وغیرہ اور عبدالقادر سروری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے چند ہی نام ہیں۔

کیا آئندہ بھی ہماری برادری ان مخصوص اصناف ادب، نثر، فکشن، ڈرامہ، تاریخ ادب اردو، اور قواعد سے پرہیز ہی کرتی رہے گی۔ اور غیر استادوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کر کے کلاسوں میں پڑھاتی رہے گی ——؟

غیر استادوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی علمی و ادبی خدمات، قابل تحسین، قابل تعریف اور اطمینان بخش سہی، مگر استاد بھی تو ادب کا نباض بلکہ بہترین نباض ہوتا ہے۔ تو کیا وہ بہترین خالق نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے خیالوں، نظریوں، اور قولوں کو صدہا نوجوانوں کے ذہنوں میں جاری و ساری کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر وہ اپنے تدریسی و تعلیمی مصروفیتوں کے دوران تھوڑی سی، فرصت نکال کر علمی و ادبی تخلیقوں کو جنم دینے لگے تو اس کی تخلیق بے شک زیادہ مفید، معلوماتی، فکر انگیز، زیادہ باترتیب و سلیقہ، والی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ استادوں کو اپنی صلاحیتوں کو یوں رائیگاں نہیں کرنا چاہئے، اپنی صلاحیتوں کو وہ ضرور متحرک کریں گے۔ اپنے علمی و ادبی ذوق و شوق کو نمایاں کرتے رہیں گے اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے واسطے یہ بے حد ضروری ہے۔

ii کرناٹک میں اردو

کرناٹک میں اردو کی عمر ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ نویں صدی ہجری کے نصف اول میں لکھے گئے تحریری نمونے دستیاب ہو چکے ہیں۔ نویں صدی ہجری میں اردو کی تحریروں کا یہ سلسلہ گلبرگہ اور بیجاپور سے جو شروع ہوا ہے تو آج تک برابر جاری ہے۔ البتہ اس کے مرکز بدلتے آئے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر سوچا کہ قدیم زمانے کے نادر مخطوطات خصوصاً وہ جو شائع نہیں ہوئے ہیں انہیں بھی نمائش میں ضرور شامل کیا جائے۔ ان مخطوطات اور نادر مطبوعات کو حاصل کرنے کے لئے دور دراز مقامات کا سفر کرنا تھا۔ زر کی کمی اور محنت کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے اس خواہش کو پوری طرح عملی جامہ نہیں پہنایا گیا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ بہرصورت کرناٹک میں اردو والے حصہ کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقہ پر کی گئی تھی۔

i۔ کرناٹک کے جامعوں کے اساتذہ کی کتابیں۔

ii۔ کالجوں کے سالنامے،

iii۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اردو مصنفین کی کتابیں جو زیادہ تر مذہبی نوعیت کی اور منظوم ہیں۔

iv۔ کرناٹک کے غیر اساتذہ دور حاضر کے مصنفین کی کتابیں۔

v۔ کرناٹک کے مختلف مقاموں سے نکلنے والے رسالے۔

vi۔ کرناٹک کے قدیم و جدید اخبار۔

ریاست کرناٹک یا قدیم ریاست میسور کا پہلا اردو اخبار "قاسم الاخبار" ہے جو ۱۸۶۳ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر محمد قاسم بن غلام حسین بنگلوری ہیں۔ فن شاعری میں انھیں کمال حاصل تھا۔ کبھی غم اور کبھی شاد، تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے "بزم غم" بنگلور میں قائم کر رکھی تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اسی بزم سے ایک اور اخبار منشور محمدی جاری ہوا تھا۔ اخباروں کا یہ جو سلسلہ بنگلور سے شروع ہوا تھا آج تک قائم ہے روزنامہ

ہفتہ وار، ماہنامے اور سالنامے، برابر نکل رہے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان یہاں ترقی کرتی جا رہی ہے اور اس زبان کے لکھنے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

بچوں کا ادب

از نما۔

ریاست کرناٹک کے مختلف مطبوعوں سے خصوصاً شہر بنگلور کے خاص خاص مطبوعوں سے بچوں کے لئے قصہ کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں کثیر تعداد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کتابوں کی بھی نمائش کی گئی تھی جسے اکثر اساتذہ نے پسند کیا اور بچوں کے ادب پر اس قدر ذخیرہ پر اپنی حیرانی اور مسرت کا اظہار کیا ٭ ٭

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

(نقل مطابق اصل)

بقیہ صفحہ نمبر ۱۳۱ سے

شیتل داس نے لکھا ہے

خوبی سی دولت ملی تجھے، پر تیرا دل نہ اُدار ہوا
تو عیسیٰ ہوا زمانہ کا یہ درمند بیمار ہوا

سوائی پرتاب سنگھ (برج ندھی) کا شعر ہے

نہ لگی اک پلک، پلک سے پلک
بیٹھے ہی آفتاب آیا جھلک

اردو زبان کی تاریخ کے ایک اور پہلو پر خصوصی توجہ دی جانی چاہئے یہ ہے شمالی ہند کی بولیوں کی گروہ بندی۔ اور مغربی اور مشرقی ہندی کی فنی اصطلاحات یہ تصور گریرسن کے ذہن کی پیداوار ہے۔ وہ جب لسانی جائزہ مرتب کر رہا تھا اس وقت کھڑی بولی کا ہندی روپ ترقی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مشرق کی اودھی اور مغرب کی برج کے شعری سرمائے کو ہندی شعری سرمایہ اور دوسری بولیوں کو بھی ہندی کہا جانے لگا تھا۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۱۴۱ پر)

ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی۔
ریڈر شعبۂ اردو علی گڑھ

نصابات اور ان کے معیار کا مسئلہ

امتحان کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے میرے ایک بزرگ نے مجھے لکھا۔ " یہ زمانہ معیار سازی کا نہیں بلکہ اردو کی بقا کے مسئلہ کا ہے۔ امیدواروں کے جوابات اسی نقطۂ نظر سے دیکھے جائیں "

اس تحریر نے میرے لئے ایک مسئلہ پیدا کر دیا۔ یہ مسئلہ ہم سب کا بھی مسئلہ ہے۔ جس سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شاید سبھی اساتذہ دوچار ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیمی مدارج کی جو تقسیم ــــ ہائر سکنڈری بی۔ اے۔ اور ایم اے میں کی گئی ہے اس سے ہم کن چیزوں سے مختص کریں مختلف درجات میں کن چیزوں پر زور اور توجہ دیں۔ مختلف درجات کے امتحانات میں شامل ہونے والے طلباء سے کم از کم کن باتوں کی توقع کریں۔

اگر بہت ہی سرسری سی تقسیم کی جائے تو وہ یوں ہو سکتی ہے کہ ثانوی درجات کے طلباء کو زبان و بیان پر پورا عبور حاصل ہو جانا چاہیے یعنی وہ کم از کم قواعد کی غلطیاں نہ کریں۔ جملے ٹھیک لکھیں، محاورے کے صحیح استعمال پر قادر ہوں۔ اور املا کی غلطیاں ان سے سرزد نہ ہوں، بی اے کے طلباء اپنی زبان پر قدرت کے ساتھ ادب سے واقف ہوں، خواہ ان کی یہ واقفیت گہری نہ ہو لیکن درست ہو۔ وہ اشعار و عبارات کو سمجھ سکیں اور ان کے مطالب و مفاہیم کو بیان کر سکیں۔ ایم اے کے طلباء اسی تناسب سے ادب کی وسیع معلومات بہم پہنچا لیں۔ اور ثانوی درجات سے جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے، یعنی زبان کا صحیح استعمال، اپنے خیالات کی مناسب زبان میں ادائیگی، ادب سے واقفیت ــــ ان سب کو مجموعی طور پر استعمال کر سکیں۔

وہ ادبی مباحث پر گفتگو کر سکیں۔ اپنے مطالعے سے جو معلومات انھوں نے بہم پہنچائی ہیں ان کا اظہار کر سکیں۔ مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات پرچہ جات اٹھا کر دیکھیں تو سوالوں کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلباء سے انھیں باتوں کی توقع کی جاتی ہے ان میں ادنیٰ اور اعلیٰ درجات متعین کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک کم از کم معیار ضرور برقرار رکھنا ہوگا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور ہمارے طلباء ان سب معیاروں سے گذر چکے ہیں۔ ایم اے کے امتحانات کی کاپیوں کے بارے میں اگر یہ نہ معلوم ہوں کہ یہ ایم اے کی ہیں تو بیشتر جوابات کے طرزِ تحریر، عبارت، مضمون، خیال کسی بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ یہ ایم اے کے طالب علم کی لکھی ہوئی ہیں یہاں ہم سب اساتذہ ہی موجود ہیں۔ اور ان چیزوں سے شاید اسی طرح سب کا سابقہ ہوتا ہوگا۔ لیکن تفننِ طبع کی خاطر چند مثالیں ملاحظہ کر لیجئے۔

بی اے کے امتحان میں سوال کیا گیا کہ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجئے۔

مانندِ حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی   کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

تشریح کی گئی۔

اس شعر میں درد اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری آنکھ رات میں بھی کھل گئی اور میں نے اپنے محبوب کو پکڑنا بھی چاہا لیکن اس وقت میرا بدن ایسا ہو گیا جیسے کہ (کہ) میرے بدن کے اندر دم ہی نہیں رہا ہو۔ ایسی حالت میں میں اس کو کیسے پکڑ لیتا۔ (بی اے فرسٹ ایر)

تشریح کے لئے شعر تھا۔

گردن کشی کیا کام آئی مانند بگولے کے   اس دشت میں سرگاڑے جوں سبیل چلا جاتا

تین مختلف طلباء کی تشریحات ملاحظہ ہوں۔

(۱) اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میری گردن کشی کی گئی اور مار کر میرا سر جنگل میں گاڑ دیا گیا۔ میرا قتل کر دیا گیا۔ اور میرا سر کاٹ کر جنگل میں دفن کر دیا گیا۔

(۲) گردن کو اس طرح موڑ موڑ کر دیکھنا تھا اور بگولے کی طرح آنکھیں جھکانا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس زمین میں سر گاڑے ہے) وہ سرگاڑ کر اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح کہ زمین کے اندر سیل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۳) وہ کہتے ہیں اگر میرا محبوب میری گردن ہی کاٹ دے تو مجھے برا نہیں معلوم ہوگا ۔ وہ میرے اوپر غصے ہو ، ایسا آتا ہے کہ جیسے کوئی آندھی کا بگولہ لیکن مجھے وہ بھی برداشت ہے ۔ میں خواس دنیا کے اندر زمین میں اپنا سر گاڑ کے بڑا رہوں گا ۔ اور اپنے محبوب کے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا چاہے میرا سر کیوں ل کٹ جائے ، جب مجھے میرا محبوب حاصل ہو جائے گا تو سب کچھ ہے ۔ ورنہ زندگی بالکل بیکار ہے ۔

اب ذرا ایم اے کی طرف آئیں ۔

سوال تھا ۔ ”تنقیدی نقطۂ نظر سے تذکروں کی اہمیت کا جائزہ لیجئے ۔“

تین صفحات میں سوال کا جواب لکھا گیا ۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو ۔

”میر حسن نے مثنوی سحرالبیان لکھی ۔ اس میں بے نظیر اور بدر منیر کے زندگی حیات کا پورا تذکرہ بیان کیا ہے ۔ ——— لیکن یہ بھی تنقید سے خالی نہیں ہے ۔

”جناب دیا شنکر نسیم نے جو مثنوی گلزار نسیم کے نام سے لکھی اس میں بھی ایک شہزادی اور ایک شہزادے کا تذکرہ موجود ہے ۔ لیکن یہ بھی تذکرہ تنقید سے خالی نہیں رہا ۔“

سوال تھا ۔ ”غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے ۔“ کیا آپ اس قول سے متفق ہیں ۔؟ مدلل لکھئے ۔

پانچ صفحات کے جوابات میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔

غزل میں ردیف قافیہ کی بندش بہت ضروری ہے ۔ غزل کے اوپر کے دو شعر اور نیچے کے دو شعر ایک ہی قسم کے ہونے چاہئیں ۔ بغیر اس کے غزل کا مطلب ہی ختم ہو جائے گا ۔ ——— غزل ایسی چیز ہے جس کے ہر انسان اپنے ذہن کو متعین کر لیتا ہے ۔ اپنے بھٹکے ہوئے الجھے ہوئے ذہن کو صاف کرنے کے لئے اس کی مدد لیتا ہے ۔ آخر میں جب نتیجہ دیکھتا ہے تو بالکل ہی سکون پاتا ہے ۔ صرف غزل میں یہ خصوصیت ملتی ہے ۔

ایک یونیورسٹی کے ایم اے میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کا بھی ایک حصہ شامل ہے ۔ سوال تھا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیجئے ۔ انگریزی عبارت میں ایک جملہ تھا ۔

ترجمہ کیا گیا۔ "امیر خسرو محکمۂ تعلیم کا انتظام کرتا تھا"
بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اور زیادہ افسوسناک بن جاتی ہے
جب ایم اے کی کاپیوں میں فقرہ کو "الف" سے، ارمن کو "حائے حطی" سے، محو
کو "ہائے ہوز" سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ اور صحیح بدل کر سہی بن جاتا ہے۔ رجحانات
کو ہائے ہوز سے لکھا جاتا ہے۔ اور بدل کر رہجانات کر دیا جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس وقت اردو کی بقا کا مسئلہ ہے۔ اور اس
وقت معیار بندی، معیار سازی سے زیادہ اس کی بقا کو مدنظر رکھنا ضروری
ہے۔ لیکن سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی آخری اور نچلا سے نچلا معیار
ہے جہاں ہم ٹھہر سکیں۔ اس مسئلہ کے چند اور اہم پہلوؤں پر بھی غور کرنا
ہوگا۔ مجھے چند یونیورسٹیوں کا تجربہ ہے۔ وہاں ایک عام شکایت سننے
کو ملتی ہے کہ زبانوں کے امتحانات میں سب سے کم نمبر پانے والے طلبا اردو
کے ہوتے ہیں۔ ہندی، فارسی، سنسکرت، عربی وغیرہ میں طلبا کو کہیں زیادہ
نمبر ملتے ہیں۔ یہ لوٹ کرنا دشوار ہے کہ ان زبانوں میں امتحان دینے
والے طلبا کی کارکردگی زیادہ بہتر ہوگی کہ ان شعبہ جات میں جانے والے
طلبا بھی اسی سماج اور انہیں طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

خود میری یونیورسٹی میں ایک بار یہ مسئلہ کافی سنجیدگی اختیار کر گیا۔ اور وہ اس
وقت کہ جب پی۔ ایچ۔ ڈی کے وظائف عطا کئے جانے کے سلسلے میں پوری فیکلٹی
آف آرٹس کی درخواستوں کو ایم اے میں حاصل شدہ نمبروں کی ترتیب رکھنے کی
تجویز کی گئی۔ معلوم ہوا کہ جو چند وظائف دستیاب تھے وہ سب کے سب
فارسی، سنسکرت، عربی اور پھر ہندی کے شعبوں پر ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ
دیگر شعبوں بشمول اردو میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے امیدواروں نے
بھی ۶۰ فیصد سے کم ہی نمبر حاصل کئے تھے۔ جبکہ یہ ترتیب ۸۲ فیصدی سے
شروع ہوتی تھی۔ اس طور پر ہمارے طالب علم مالی امداد و اعانت سے محروم
رہ جاتے ہیں۔ سوچنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہے اور اس کا حل کیا ہے۔

اس صورت حال کا براہ راست نصابات پر بھی پڑ رہا ہے جب
یہ سوچتے ہیں کہ نصابات کی ترتیب بھی امتحان دینے والے انھیں طلبا کے لئے

ہوتی ہے جو علمی معیار کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں تو لازماً ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ نصابات کو آسان تر بنایا جائے۔ ان میں کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے تخفیف کی جاتی ہے۔ اور یوں سال بہ سال نصابات کا معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال اور یونیورسٹیوں میں زیادہ سنجیدہ نہ ہو، جبکہ ایسی یونیورسٹیاں جو براہ راست تدریس سے تعلق رکھتی ہیں اس صورت حال سے زیادہ متاثر ہو رہی ہیں۔ دراصل ایک کشمکش ہے نصابات کو مرتب کرتے وقت اگر ایک طرف علمی معیار کا خیال ہوتا ہے تو دوسری طرف طلبا کے معیار کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی مومن، درد، غالب کی بعض غزلیں اس لئے خارج از نصاب کردی جاتی ہیں کہ ان میں دقیق مسائل کو ادق زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ کبھی افسانوں اور ان کے اقتباسات کو حذف کیا جاتا ہے کہ ان کی مرصع و مسجع زبان بے حد مشکل ہے۔ کبھی تو انگریز اقوام کا عمل ہوتا ہے کہ ان میں مزاح کی سمجھ ان کو بوجھل بنائے ہوتے ہیں۔ کبھی قدیم اردو کے نمونوں کو خارج کردیا جاتا ہے کہ ان کا سمجھنا دشوار ہے۔ کبھی کلام کی مقدار میں کمی کردی جاتی ہے کہ طلبا کے لئے اتنا کچھ پڑھنا ممکن نہ ہوگا۔ اور کمتر ہونے کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس سلسلے میں اگر ایک طرف طلبا کی کارکردگی، نصابات کی مقدار و موضوعات پر غور و فکر کی ضرورت ہے تو دوسری طرف خود ہم اساتذہ بھی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ اگر ثانوی درجات سے گذرنے کے بعد اور کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر آکر بھی زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوتی، جملے غلط لکھے جا سکتے ہیں، املا کی غلطیاں ہوتی ہیں، مربوط عبارت نہیں لکھی جا سکتی ہے۔ اظہار خیالات پر قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے ادب کی تفہیم نہیں پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کا کیا اور کس طرح تدارک کیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسے اقدامات لئے جا سکتے ہیں کہ محدود وقت میں ان کوتاہیوں کا بھی ازالہ ہو سکے جو ثانوی درجات پر باقی رہ گئی ہیں۔ اور زبان و ادب کی ان ضرورتوں کو بھی پورا کیا جاسکے جو کالج اور یونیورسٹی تعلیم کا تقاضا ہیں ہم اپنے طالب علموں کو ایک خاص معیار تک پہنچنے پر مجبور بھی کر سکیں، زبان و ادب کے بارے میں ان کو ضروری اور مناسب معلومات بھی فراہم کر سکیں۔ اور مختلف درجات میں ادب کے بارے میں جو شعور و آگہی ان کو حاصل ہونی چاہئے تدریسی

رہنمائی سے اس کی لگن بھی ان کے اندر پیدا کر سکیں۔

تحقیق و تنقید کے اصولی تر مسائل بھی ہماری توجہ اور غور و فکر کے مستحق ہیں لیکن اس بنیادی مسئلہ سے بھی ہم صرف نظر نہیں کر سکتے یہ مسئلہ اگر نظر انداز ہوا تو تحقیق و تنقید کی عمارتوں کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہوتی چلی جائیں گی۔ ●●

بقیہ صفحہ نمبر ۱۳۵ سے

اس نے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہ کی کہ ان بولیوں کو ہندی کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ وہ لکھتا ہے

"ہندی نام عام طور پر ان تمام آریائی زبانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو مغرب میں پنجاب، مشرق میں مہانندا، شمال میں ہمالہ اور جنوب میں نربدا کے درمیان بولی جاتی ہیں۔"

اس نے بہاری اور راجستھانی کو اس گروہ بندی میں شامل نہ کیا۔ لیکن بعد کے کچھ ماہرین لسانیات ان بولیوں کو بھی ہندی کہنے لگے۔ اور نربدا کے اس پار برہان پور یعنی تاپتی کے کنارے تک کے علاقہ کو ہندی علاقہ میں شامل کر لیتے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء پر لکھنے والوں نے گریرسن کی تقلید کی اور اس مفروضہ پر غور و فکر کی زحمت نہ کی۔ شوکت سبزواری نے غالباً سب سے پہلے مغربی ہندی کے تصور کو ایک طرح کی ذہنی تجرید یا منطقی اپج کہا ہے لیکن ڈاکٹر مسعود حسین خان، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر گیان چند اس مفروضے پر معترض نہ ہوئے، ڈاکٹر گیان چند مشرقی اور مغربی ہندی کے تصور کو صحیح ماننے کے لیے جو جواز پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے

"پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں نئی زبان کے حسب و نسب کا کھوج لگانا بڑا پیچیدہ کام ہے پھر بھی ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ مغربی ہندی شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہے۔ اور مشرقی ہندی اردھ ماگدھی پراکرت اور اردھ ماگدھی اپ بھرنش کی۔"

بقیہ صفحہ نمبر پر

اردو تحقیق میں جہتوں کا تعین

اردو شعبے اب ملک کی مختلف دانش گاہوں میں قائم ہیں اور یہ فی الجملہ طمانیت و مسرت کی بات ہے۔ لیکن اردو میں اعلیٰ سطح پر تعلیم و تدریس کی سہولتوں کی فراہمی اور ان کی مزید ترقی و توسیع کی خواہش کے ساتھ اب جہاں ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ امیدواروں کی ایک بڑی تعداد کو اردو میں تحقیق و تنقید کی ذمہ داریاں سپرد کریں۔ وہاں یہ سب سے بڑی ذمہ داری شعبہ ہائے اردو اور ان کے سربراہوں پر آ پڑی ہے کہ کن موضوعات پر کام کرایا جائے، اور کیوں کرایا جائے۔ اب تک اردو تحقیق کا کام بہت کچھ مقصد و منہاج کے تعین کے بغیر ہوتا رہا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ان مقالوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بعض مقالے علمی تحقیق کے اچھے اور اونچے معیار پر پورے اترتے ہیں اور ان سے اردو کے علمی خزانے میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ لیکن بہت سے مقالے وہ ہیں جن سے ان مقاصد کی تکمیل میں فی الحال کوئی مدد نہیں ملتی جو اس وقت اردو والوں کے سامنے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مقاصد کیا ہیں۔ میرے خیال میں ان سب سے اہم تدوین لغت و ترتیب قواعد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس سلسلے کا بنیادی کام پہلے نہ کر لیا جائے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج اور ترقی کے سلسلے صرف دہلی، اور لکھنؤ ہی سے وابستہ نہیں گجرات، بیجاپور، گولکنڈہ، دکن سے بھی اس کی راہ ارتقا کی کئی منزلیں اور مرحلے وابستہ ہیں۔ احمد نگر، بیدر، اورنگ آباد، فیض آباد، مرشد آباد، عظیم آباد، برہان پور، ٹانڈہ، بھرتپور، اور جے پور، جیسے بہت سے شہروں اور مرکزوں سے بھی اس کا تعلق رہا ہے۔ ان کی زبان، انداز بیان، روزمرہ اور محاورہ کا اثر ان شہروں کے معروف و غیر معروف، ادیبوں نے قبول کیا ہے۔ ابتک ہمارے یہاں علاقائی سطح پر اردو شعر و ادب کی خصوصیات کا اگر کچھ مطالعہ کیا بھی گیا ہے تو مفروضہ ایسے مختلف مطالعات کے مابین اشتراک و اختلاف کے عناصر کا پورے طور پر جائزہ نہیں لیا گیا۔ جب تک یہ تمام ذخیرہ جمع نہ ہو جائے اور بالو توفی سطح پر

ان جمع شدہ وسائل کی تنقید، تحقیق اور ادبی تفہیم ممکن نہ ہو، اردو زبان کا کوئی بھی مبسوط لغت اور اس کی کوئی ایسی گرامر کیسے مرتب کی جا سکتی ہے جسے کہا جا سکے اور پھر اس کا تعلق صرف قواعد و لغت سے نہیں ہے بلکہ تقابلی اور تاریخی لسانیات سے بھی ہے،

اس کے لئے ان علاقائی بولیوں اور ادبی زبانوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن کے ارتقاء کے مختلف ادوار میں اردو زبان اور اس کے ادب نے کم و بیش اثرات قبول کئے ہیں۔ ان اثرات کو جاننے اور ان کا جائزہ لئے بغیر بہت سے الفاظ کی اصل اور صحیح شکل کو جاننا اور ایک خاص دور میں اس کے معنی و تلفظ کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ اردو میں ایک ہی معنی رکھنے والے لفظ کی مختلف شکلیں بھی رائج ہیں اور ایک ہی لفظ مختلف معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ اختلاف زمانی اور مکانی بھی ہوتا ہے۔ اور مختلف علوم کے دائرہ میں اس کے استعمال سے بھی یہ صورت پیدا ہوتی ہے محاورے اور روزمرہ کے تحت ان کے استعمال سے بھی یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ محاورے اور روزمرہ کے تحت ان کے استعمال سے بھی معنی و مفہوم کا اختلاف جنم لیتا ہے۔ اس طرح لفظ کے استعمال کے چار دائرے بن جاتے ہیں۔ لسانی، علمی، ادبی اور عمومی۔ ادبی میں محاورے اور روزمرہ کو بھی شامل سمجھنا چاہئے۔ بدقسمتی سے اردو میں نہ محقق طور پر لسانی روایت کے مطابق کوئی لغت مرتب ہوا، نہ مصطلحات علمیہ کو یکجا کیا گیا۔ نہ الفاظ و اصطلاحات کے ادبی مفاہیم و معانی پر قاموس کی تیاری پر توجہ مبذول کی گئی نہ محاورات اور روزمرہ اور کنایات کو اصل ٹھہراتے ہوئے کوئی بڑا علمی کام دیا گیا۔ کچھ کام اس سلسلے میں ہوا ہے لیکن ایک بڑی علمی ادبی اور تہذیبی زبان کے لئے مصنوعی قاموسوں کی ضرورت ہے۔ اس سے ابھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ ہندی میں سب سے کوشش بنا رہے ہوئے مگر اردو میں ابھی تک اتنا بھی نہیں ہوا۔ اس کے لئے وسائل کی کمی کی بات اپنی جگہ پر ہے لیکن سوال ان علمی وسائل کا ہے جو جگہ جگہ سے فراہم ہوں گے اور جن کے لئے ایک منصوبے کے تحت کام کرنا ضروری ہے۔

اردو زبان کا بھی مقامی بولیوں سے وہی رشتہ ہے جو خود ہندی کا ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم مختلف ریاستوں کی مقامی بولیوں سے اردو کے لسانی، ادبی، اور تہذیبی رشتوں کا پتہ چلائیں اور چھوٹے چھوٹے پراجکٹوں کے ذریعہ اس کام مختلف شعبوں کو مکمل کریں۔

اردو کے اشتقاقی مسائل کی دریافت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اردو قواعد کو اس کی صحیح اور وسیع بنیادوں پر ترتیب دیا جا سکے۔ ایک اور اہم بات دوسری زبانوں اور بولیوں کے ساتھ اردو کے ادبی اور تہذیبی رشتوں کی بازیافت کی کوشش ہے۔ اردو میں بعض اصناف اور اردو شاعری کے بعض میلانات ہیں جو ہندوستانی زبانوں سے مستعار یا مستفاد ہیں۔ افسانوں اور کہانیوں میں بہت سے اجزا ایسے ہیں اور روایتیں ایسی ہیں جو لوک کتھاؤں یا ان کے تحت dew lok ہونے والی منظوم کہانیوں سے بالواسطہ یا براہ راست آئی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض فارسی قصوں میں ہندی عناصر کی شمولیت کا رجحان مختلف قصہ نگاروں کے بیان میں نمایاں رہا ہے۔

ایسے ہندی قصوں اور کہانیوں پر تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے بغیر اردو قصوں پر کیسے کوئی ڈھنگ کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ بہت ابتدائی مراحل میں ہے۔ اور کہیں کہیں تو اسے ہندی میں کئے جانے والے کام کی نقل محض کہہ سکتے ہیں۔

اردو کی لسانی تاریخ کی باقاعدہ ترتیب تو ابھی کافی دور کی بات ہے ابھی ادبی تاریخ کی ترتیب ہی میں بہت سے مرحلوں سے گزرنا باقی ہے۔ ہماری تحقیق اور تنقید کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اردو کی مبسوط ادبی تاریخ کیسے مرتب کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے دور بہ دور اردو کی ادبی تاریخ مرتب کی ترتیب ضروری ہے۔ اور یہ ضرورت اس وقت تک پوری نہیں ہوگی جب تک کہ ایک دور کی صرف یہی نہیں کہ اہم ادبی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا تحقیقی جائزہ لے لیا جائے۔ بلکہ اس دور کے تذکروں اور بیاضوں پر بھی الگ الگ کام نہ کر لیا جائے۔ یہ کام کوئی ایک شخص نہیں کر سکتا، یہ الگ الگ امیدواروں کو سپرد کیا جائے، اور احتیاط کے ساتھ ان کے کام کی نگرانی کی جائے۔

اردو کی راہ میں اخبارات و رسائل نے قدم قدم پر چراغ جلائے ہیں۔ اب تک اردو صحافت پر تو کچھ کام ہوا ہے لیکن اردو صحافت نے اردو کی ترقی و ترویج اور اس کے نفسیات کی توسیع اور اس کے ادبی لہجے کی تشکیل میں جو حصہ لیا ہے اس پر کافی و شافی تو کیا ابتدائی کام بھی ہنوز نہیں ہوا، اردو میں انشائیہ نگاری، مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کا تمام تر ذخیرہ اخبارات و رسائل کے صفحات میں ہے۔ ان کی ورق گردانی اور علمی و لسانی اور ادبی نقطۂ نظر سے ان کی

نقطۂ نظر سے ان کی اشاریہ سازی کا کام اگر سچ پوچھئے تو ہم نے باقاعدگی سے شروع بھی نہیں کیا۔

اردو شاعری اور قصہ نگاری کا تہذیبی مطالعہ بھی بہت ابتدائی مراحل میں ہے۔ اور دوسرے علمی و تحقیقی کوششوں سے آنے والی روشنی کا منتظر ہے۔ اردو زبان کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کی علامت ہے۔ یہ مشترکہ تہذیب اپنے مختلف النوع اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے کیا ہے کون سے اجزا اس کے اپنے مزاج اور ضمیر و خمیر میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اور کون ایسے ہیں جن کو دھنک کے رنگوں کی طرح الگ الگ بھی دیکھ اور پرکھا جا سکتا ہے۔ تہذیب جن اداروں سے عبارت ہے وہ کیا ہیں اور اردو شعر و ادب پر ان کا impact کیا اور کس صورت میں ہے۔ حد یہ ہے کہ اردو میں ابھی تک اس کی تشبیہات، استعارات اور مجاز کنایہ پر بھی کوئی ایسا کام نہیں ہوا جس کی مدد سے اس کی تہذیبی قدر و قیمت کا تعین اور اس کے تمدنی مزاج کا تجزیہ کیا جا سکے۔

اردو میں حسن و عشق کی بات بار بار زبان پر آتی ہے۔ لیکن اردو ہندی اور فارسی شاعری میں حسن و عشق کا تصور کیا رہا ہے اور کیوں آیا ہے اس پر کوئی باقاعدہ کتاب شاید ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔

اردو زبان اور اس کے ادب نے اپنی ترقی اور توسیع کے بہت سے مرحلے تراجم کے ذریعے طے کئے ہیں لیکن اس کام سے متعلق ہم کس طرح معلومات حاصل کریں یہ بات اب سوچی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کافی دقت طلب ہے۔ اور اس کے لئے پہلے کچھ دائرے مقرر کر کے کام شروع کیا جانا چاہئے۔ مختلف ادوار میں ترجموں کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اصطلاح سازی کا کام ادارتی اور انفرادی سطح پر کس نہج پر اور کس معیار کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔

اردو میں ریفرینس بکس کے کام کو بھی اگر سچ پوچھئے تو چھیڑا بھی نہیں گیا۔ لوک گیت اور لوک کتھائیں تو اردو میں جمع بھی نہیں کی گئیں ان کے تہذیبی اور تنقیدی مطالعے کی بات تو الگ رہی۔

اردو میں جہاں مختلف مذاہب اور سیاسی و سماجی تحریکوں کی تبلیغ ہوئی ہے وہاں اردو رسم الخط میں علاقائی زبانوں کے ادب کا ایک بڑا حصہ شائع ہوا ہے اگر اس کا صحت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو علاقائی ادبیات کے فروغ میں اردو کے حصے پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ پنجابی، (گورمکھی)، اور گجراتی رسم الخط میں اردو سے

تعلق رکھنے والی بہت سی کار آمد چیزیں موجود ہیں۔ ان کو ادھر سے ادھر لانے سے خود اردو رسم الخط کے تاریخی ارتقاء پر تہذیبی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے کام کی گنجائش ہے۔

اردو میں ادبی تحقیق کا کام کرنے والے بالعموم مختلف شاعروں اور ادیبوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی شاعر کے یا ادیب کے ہم عہد شعراء اور ادباء کے متون کے مطالعے کے بغیر اس نوعیت کا کام کیسے ہو سکتا ہے۔ متن کے غائر مطالعے کے بغیر تنقید کرنے کی کوشش نے ہمارے بہت سے نقادوں کے کام کو ان کی زندگی ہی میں وزن اور وقار سے محروم کر دیا ہے۔ تحقیق کی بات دوسری ہے۔ وہاں پوری ذمہ داری سے تحقیق کرنے کی کوشش کے باوصف یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ نئے ماخذ کی دریافت کے بعد قدیم استناد نظر ثانی کا محتاج ہو جائے۔

ان مسائل پر گفتگو کافی آگے تک بڑھ سکتی ہے لیکن مزید بعض امور سے متعلق کی تفصیل میں جانے کے لئے وقت بہت کم ہے۔ ماحصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کے پھیلے ہوئے کام کو کچھ ایسے مقاصد کا پابند بنایا جائے جس کے بغیر ہم نہ اپنی ادبی تاریخ مکمل صورت میں ترتیب دے سکتے ہیں نہ لغت و قواعد کی ادبی و لسانی سطح پر شدید ممکن ہے، نہ اردو شاعری اور اس کے ادب کے تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ مطالعہ ممکن ہے نہ اردو صحافت کی تاریخ میں بکھرے لسانی و ادبی حقائق کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ نہ ترجمہ نگاری کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ نہ دوسری زبانوں اور بولیوں کے ساتھ اردو کے لسانی اور ادبی رشتوں کی تفہیم کا کام صحیح طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

علاقائی یونیورسٹیاں علاقائی ادب اور مقامی زبان اور ادبیات کے ساتھ ان کے ادبی اور لسانی رشتوں پر زیادہ مفید کام کر سکتی ہیں۔ مخطوطات و مطبوعات کی دریافت اور ان کے تعارف میں بھی ان کا نمایاں حصہ ہو سکتا ہے۔ لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد، اور بیجاپور جیسے بڑے ادبی مرکزوں میں اردو شعر و ادب نے اپنی ترقی اور وسعت ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں ان پر کام اور ان مرکزوں سے متعلق یونیورسٹیاں ہی کر سکتی ہیں۔ تحقیقی موضوعات پر اگر اساتذہ اردو کی کوئی مرکزی کمیٹی وقتاً فوقتاً غور کرتی اور اس سلسلے میں مختلف شعبہائے اردو

کو مشورہ دیتی اور باہمی مشورے کے ساتھ اپنی سفارشات شائع کرتی ہے تو بہ زیادہ مناسب ہے۔ اس وقت ایک موضوع پر مختلف درس گاہوں اور علمی مرکزوں میں جو کام ہوتا ہے اس۔ duplicate پڑھتا ہے۔ اور اردو میں اس سے بچنے کی سخت ضرورت ہے۔ جن طلبہ کو داخلہ دیا جائے ان کی تعداد کو بڑھانے کی بجائے ان کے علمی معیار کو بلند کرنے اور رکھنے کی امکانی سعی ضروری ہے۔

ص۱۴۱ کا بقیہ

لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ابتک ایسے نمونے فراہم نہ ہو سکے جنہیں مغربی یا مشرقی ہندی کہا جا سکے۔ اگر ان کا سراغ لگانے میں کامیابی بھی حاصل کر لی جائے تو کیا ضروری ہے کہ انہیں مشرقی اور مغربی ہندی ہی کہا جائے۔ مشرقی و مغربی ہندی کے تصور کو اردو زبان کی تاریخ میں کوئی جگہ نہ دی جانی چاہئے۔ گریرسن کے اس تصور سے ہندی زبان کے مورخین نے فائدہ اٹھایا اور اردو زبان کے مورخین نے تقلیدی روش اختیار کر کے بہت سی الجھنیں پیدا کر دیں۔

ایم اے کے نصاب میں عام طور پر تاریخ ادب اردو پر زیادہ اور تاریخ زبان اردو پر کم توجہ دی جاتی ہے اور اگر تاریخ زبان اردو کا مطالعہ کیا بھی جاتا ہے تو وہ کافی حد تک نامکمل رہتا ہے

طلباء ہند آریائی زبانوں کی خاندانی تقسیم پراکرت، اور اپبھرنش کی مختلف قسموں، مشرقی و مغربی ہندی کی فرضی تقسیم اور اردو کے آغاز کے متعلق مختلف نظریات کی تائید و تردید میں ہی الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اردو کی تاریخی و تہذیبی اہمیت سے طلبا کو واقف کرانا اور تاریخ زبان اردو کی تدریس کا بنیادی مقصد ہونا چاہئے: تاکہ طلبا میں یہ صلاحیت پیدا ہو سکے کہ وہ مخالفین اردو کے نظریات کا مدلل جواب دے سکیں۔ اور یہ جان سکیں کہ اردو تعصب، تنفر اور نفاق سے وجود میں نہیں آئی اور یہ زبان نہ تو ہندی کے لئے خطرہ ہے نہ ہندوستان کے لئے بلکہ ہندو مسلم تہذیب کی ہم آہنگی، یکجہتی اور رواداری کی علامت ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں اس خصوصیت پر زیادہ زور دینا چاہئے۔ —— ⁂ —— ⁂ ——

اساتذہ شعرا کا کلام جو ۲۸ اکتوبر کے مشاعرے میں سنایا گیا

ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشا
ناگپور یونیورسٹی

متفرقات

اک غزل یا غزل نظم نمایش کروں — سوچتا ہوں کہ بھری بزم میں کیا پیش کروں
اہل دل کتنے یہاں درد لئے بیٹھے ہیں — ہو اجازت تو ذرا ان کی دوا پیش کروں

ولہ

وہ خود میرے غم کے طلبگار نکلے — دوا دینے والے بھی بیمار نکلے
بظاہر تو تھے ناتواں ہم بھی لیکن — محبت میں اچھے جگر دار نکلے

ولہ

اس میں عکس رخ گلفام تو آجاتا ہے — دل شکستہ ہی سہی کام تو آجاتا ہے
کسی صورت کسی پہلو کسی عنواں ہی سہی — لب پہ رہ رہ کے ترا نام تو آجاتا ہے
لطف جینے میں ذرا بھی نہیں آتا ہے تو کیا — اپنے سر جینے کا الزام تو آجاتا ہے

غزل

دل پہ زخم کھانے سے اشک خوں بہانے تک — ہم نے غم سہے کیا کیا لطف زیست پانے تک
فصل نوبہاراں کو کیا خبر کہ غنچوں پر — کتنے حشر گذرے ہیں کھل کے مسکرانے تک

دل نے عزم و ہمت سے کام لے لیا ورنہ — اس پہ کیا نہیں بیتی آرزو بر آنے تک
منزلوں کی دشواری راستوں کے سناٹے — ہیں تمام اندیشے اک قدم اٹھانے تک
ہو فضا کی وسعت کا اس کو خاک اندازہ — حد فکر ہو جس کی اپنے آشیانے تک
صرف چند محلوں میں سیل نور کیا معنی — بات جب ہے یہ پہنچے ہر غریب خانے تک
سچ تو ہے یہی منشا راہ زندگانی میں — تیرگی کا خطرہ ہے شمع دل جلانے تک

ڈاکٹر افتخار الحسن عنوان چشتی ریڈر شعبہ اردو
جامعہ ملیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غزل

ہر اک نفس ہے مرا پیاس کا سمندر سا — لہو میں تیرتا پھرتا ہے ایک نشتر سا
مرے ضمیر میں برپا ہے دیر سے کہرام — مرا وجود ہے اپنے لئے ہی محشر سا
ہماری روح کے کاسے میں خاک بھی تو نہیں — اگرچہ ہم میں ہر اک شخص ہے سکندر سا
یہ کس کے خواب سلگتے ہیں میری آنکھوں میں — یہ کس کے درد کی لو کا ہے دل میں پیکر سا
بتاؤ سوچنے جذبو کہ میرے اندر کیا — چھپا ہوا ہے کوئی آدمی معـ...ـر سا
تمام خون شدہ لمحوں کے باوجود اب تک — مری حیات ہے بے منظری کا منظر سا
یہ کس کے خون کی خوشبو ہے اس میں اے عنوان — نسیم صبح کا جھونکا تو ہے معطر سا

ڈاکٹر شیام لال کالڑا: عابد پشاوری — شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں

رباعی

ہونٹوں پہ ہنسی شگفتگی چہرے پر — کام آئے گا کب تک یہ تکلف کا ہنر
اے کاش دماغ میں نہ ہوتا کچھ بھی — اے کاش کہ سینے میں بھی ہوتا پتھر

قطعہ

دیکھ کر بے حسی زمانے کی — دل میں اکثر خیال کرتا ہوں

آج کے بے وفا زمانے میں — جی رہا ہوں کمال کرتا ہوں

غزل

خاک اور خوں میں نہانے کے لئے — ایک میں ہی تھا نشانے کے لئے
زخم بھر جاتا ہے رہ جاتا ہے داغ — زخم کی یاد دلانے کے لئے
ہم کو تنکے ہی ملے برق زدہ — آشیانے کے سجانے کے لئے
دست قدرت نے بچا رکھا تھا کیوں — ہمیں بھر کے زمانے کے لئے
بھولنا پڑتا ہے خود کو اکثر — کسی کو دل سے بھلانے کے لئے
غم ہستی کو غم عشق کہا — رنگ کچھ تو ہو فسانے کے لئے
آتی ہے آکے پلٹ جاتی ہے — موت مضطر ہے بہانے کے لئے
قتل کا پردہ ہے قربانی بھی — شمع جلتی ہے جلانے کے لئے
یہاں لینے کا ہے دینا عابد — مفت مرتے ہو زمانے کے لئے

شیو پرشاد وششٹ جاوید وششٹ

شعبۂ اردو، دلی کالج، دہلی

غزل

وہ جو داغ عشق تھا خوشنما جو امانت دل زار تھا — سرِ بزم تھا تو چراغ تھا سر راہ تھا تو غبار تھا
اسے میں ہی جانوں ہوں درد تو کسو وقت اپنا بھی یار تھا — کبھو موم تھا کبھو سنگ تھا کبھو پھول تھا کبھو خار تھا
تری یاد ہے کہ کبھی کبھی، ترا ذکر ہے کہ رکا رکا — تری یاد سے تو سکون تھا ترے ذکر سے تو قرار تھا
یہ تو وقت وقت کی بات ہے ہمیں آپ سے کوئی گلہ نہیں — دم ہول آج ہم سے خفا خفا، کبھو آپ کو بھی مجھ سے پیار تھا
وہ نگر تو کب کا اجڑ گیا ہم اسی نگر سے تو آئے ہیں — کہیں مقبرہ تھا خلوص کا تو کہیں وفا کا مزار تھا
جسے شوق تھا تری دید کا جسے پیاس تھی ترے پیار کی — جو تری گلی میں مقیم تھا، وہی اجنبی سر دار تھا

ترے دل سے ہے اخلاص دل نہ جھلک سکا تو میں کیا کروں　　مرے عکس کی تو خطا نہ تھی ترے آئینے پہ غبار تھا

رباعیات

(۱)

تعمیر پہ نازاں تھے بہت فرزانے　　شہروں میں جو دیکھا تو ملے ویرانے
جاوید تھا جبراں کوئی کہتا گذرا　　انداز جنوں بھول گئے دیوانے

(۲)

مانند سحر زخم دلِ زار ہنسے　　کانٹوں میں گھرے پیار کے گلزار ہنسے
ایسے بھی کئی سانحے ہم پر گذرے　　روئے کبھی اغیار، کبھی یار ہنسے!

ڈاکٹر منظر عباس نقوی منظرؔ
شعبہ اردو یونیورسٹی کالج، علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی

روشنی کا شہر

فطرت کا شاہکار ہے صنعت میں بے نظیر　　اے اہل شہر ہے یہ بڑی دلکشی کا شہر
بنگلور کہہ لو یا اسے جو چاہے نام دو　　ہم تو اسے کہیں گے سدا "روشنی کا شہر"

بنگلور

بنگلور آکے دوستو ہم کو پتہ چلا　　ہیں کتنے دلفریب نظارے زمین پر
راتوں کو جب نگاہ اٹھی دیکھتا ہوں کیا　　بکھرے پڑے ہوں جیسے ستارے زمین پر

"شکریہ"

اے خطہ جمیل ترا دل سے شکریہ!　　کیونکر کہوں کہ تو نے مجھے کیا عطا کیا
رکھوں گا یاد تیری مسافر نوازیاں　　جو چاہتا تھا اس سے بھی مجھ کو سوا دیا

جلوہ دکھا کے اپنے رخ دلفریب کا — تو نے مسرتوں کا خزانہ لٹا دیا
یہ سب ترے حسین مناظر کا فیض ہے — منظر سے بے نوا کو بھی شاعر بنا دیا

صنعت نے حسن کو اور بھی دلکش بنا دیا — فطرت کا یہ حسین نظارہ کہ ہائے ہائے
یہ مست و عطر بیز ہوائیں کہ واہ واہ — یہ خنکی لطیف و گوارہ کہ ہائے ہائے
یہ دن میں کالی کالی گھٹائیں کہ الاماں — یہ شب کو روشنی کا نظارہ کہ ہائے ہائے
تشریف لاتے حضرت غالب اگر یہاں — ہوتا زبان پر یہی نعرہ کہ ہائے ہائے
بنگلور کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین — اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

سید عابد اختر (عرف عماد) تخلص عابد کرہانی
ایم اے، ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی ۱۷۶۸، حوض، سوئی والان دہلی ۶

غزل

عالم خواب ہی، خواب میں چلتے رہیے — رات کٹ جائے گی کروٹ تو بدلتے رہیے
کس کو معلوم کہاں سے کوئی پتھر آجائے — حوصلہ ہو تو اندھیروں میں نکلتے رہیے
بن ہی جائے گا کبھی کوئی خودی کا پیکر — اپنے احساس کی گرمی سے پگھلتے رہیے
زندگی سلسلۂ خواب بنتا ہے کوئی — رات بھر خواب سے خوابوں کو بدلتے رہیے
اک عجب آگ تعاقب میں لگی رہتی ہے — چھوڑیے گاؤں کو یا شہر بدلتے رہیے
ہم پہ کیا ہوگا زمانے کی ہواؤں کا اثر — آپ موسم کی طرح روز بدلتے رہیے

زندگی کیا ہے سرابوں کا سفر ہے عابد
وقت کی ریت پہ دن رات پھسلتے رہیے

ڈاکٹر نجم الہدیٰ شعبۂ اردو و فارسی بہار یونیورسٹی
ایل ایس کالج مظفرپور (بہار)

وقت

مطبوعہ ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ، شمارہ اگست ۱۹۷۱ء۔
بنگلور میں ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کے مشاعرے میں بھی سنائی گئی۔

یہ گردشِ صبح و شام کہتی ہے، وقت کا کارواں رواں ہے
یہ زینتِ[۱] آسماں ستارے
یہ ماہ و خورشید
آسمانوں کے بے کراں نیل میں تموج[۲] پذیر ہیں جو
——— یہ سب مسلسل سفر کے مارے ہوئے مسافر
بتا رہے ہیں یہ انقلابوں ہی کا جہاں ہے
نہ کوئی لمحہ اسیر ہو کر ٹھہر سکا ہے۔
نہ کوئی موسم ہمیشہ سایہ فگن رہا ہے
ابھرتے سورج کی تازگی بخش دھوپ کب تک!
خنک ردا چاندنی کی کب تک کسی کے سر پر!
چمن میں کب تک سموم کے ناگوار جھونکے!
(چمن ہی کب تک رہے گا باقی!)
خزاں کے بے رنگ نقش کا ارتسام تا چند رہ سکے گا!
سمٹتے اور پھیلتے یہ سائے
یہ گھٹتے بڑھتے ہوئے اجالے

---

[۱] ہم نے آسمان کو تاروں سے سجایا ہے (قرآن مجید سورہ صٰفٰت۔ رکوع ۱)
[۲] سارے کے سارے اجرام فلکی آسمان میں پیرتے ہیں (قرآن مجید، سورہ یٰسین رکوع ۳)

یہ رات کی بزم نور و ظلمت
یہ دن کی ہنگامہ آفرینی
یہ ابر کے شامیانے کچھ دن
یہ موسم برشگال کا رنگ
یہ گرمیاں اور یہ زمستاں
یہ سب پھیلتے ہوئے زمانے کے نقش پا ہیں ـــــ

یہ عالم آب و گل کا عالم
یہ دھوپ چھاؤں
نمو و اضطراب جس میں مدغم
کبھی محبت کا جام لبریز
کبھی تشنگی کا شکوہ ہے
کبھی یہ احساس، ساری دنیا مرے لئے ہے
کبھی یہ غم کہ جہاں میں میرا نہیں ہے کوئی
نہ کوئی احساس مستقل ہے
نہ مصدر حسن کوئی ہے ایسا دوام جس کے نصیب میں ہو
نہ معصیت کا وفور دو دن سے کچھ زیادہ
نہ پیکر خاک اور تورع کا ساتھ کچھ دن
(یہ پیکر خاک تا بہ کے خود!)
ثبات کے تم عدم میں جانے کو گامزن ہے
بقا کی لہریں فنا کے ساگر میں ڈوبنے کو بڑھی چلی جا رہی ہیں
یہ سلسلہ روز و شب کا، رکے نہ رک سکا ہے ـــــ بڑھے چلو وقت کی صدا ہے

ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی
شعبہ اردو جموں یونیورسٹی جموں

غزل

رہے نہ اور تمنا اگر یہی نکلے　　لبوں سے بات جو نکلے وہ آپ کی نکلے
فقیہہ شہر نے ٹھہرا دیا جسے کافر　　تمام شہر میں وہ شخص متقی نکلے
وہ ایک بات جو منسوب ہو گئی تجھ سے　　خدا کرے کہ وہ اک بات ان کہی نکلے
اب اس سے اور کڑی کیا زمانہ دیگا سزا　　کہ زیست ہو نہ سکے اور نہ جان ہی نکلے
طلوع صبح کو جھٹلاؤ مت خدا کے لئے　　کہاں کہاں سے نہ پھوٹے وہ روشنی نکلے

ڈاکٹر ظہور الدین ظہور،
شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں

غزل

اپنے ہی سوز میں اک عمر سے جلتا ہوں میں　　دوستو کوئی سلگتا ہوا صحرا ہوں میں
اوٹ میں ڈھانپ لو تم عیش کدوں کو اپنے　　دوش ایام پہ اڑتا ہوا شعلہ ہوں میں
بڑھ گیا ذات کے نیرنگ کدے کی جانب　　کھولتا رقص کناں آگ کا دریا ہوں میں
ایک ناکام تعاقب میں لگا ہوں یارو　　اپنے انفاس پہ چھایا ہوا کہرا ہوں میں
سارے گل میری نگاہوں نے کئے ہیں پیدا　　ہر طرف چاند کرن بن کے بکھرتا ہوں میں
میری ہستی میں نہاں میرا جہاں میرا عدم　　اپنی شریانوں میں سویا ہوا کعبہ ہوں میں

ہو گیا ہے شہر میں یارو عجب اک حادثہ　　ایک رہزن راہ بر کے بھیس میں پکڑا گیا
کیا خبر منزل پہ ہیں کیا کیا بلائیں منتظر　　ہر مسافر ہے اسی اک سوچ میں ڈوبا ہوا

اب کرے رہرو نہ کوئی راہبر کی جستجو — رہروانِ راہ منزل کے لئے ہے یہ صلا
ایک دھوکا ہیں یہ ساری زینتیں تہذیب کی — اک درندہ ہر مہذب دل میں ہے بیٹھا ہوا
اور انساں اک تصور کے سوا کچھ بھی نہیں — مسکن جور و جفا ہے آج بھی فہم و ذکا
قافلے والے صلیبیں لیکے کیوں نکلے ہیں آج؟ — پھر کہیں درپیش ہے دار و رسن کا مرحلہ

ڈاکٹر ذکیہ انجم ماتا سندری کالج برائے نسواں
ماتا سندری لین نئی دہلی ۲

غزل

آنکھوں میں کوئی عکس نہیں اب بھی معتبر — پیکر تراشتے رہے خوابوں کے عمر بھر
لایا ہے کس مقام پہ یہ دورِ بے حسی — پتھر میں ڈھل کے رہ گئے ہم قصہ مختصر
اپنا مزاج ہی تھا بہت سادگی پسند — ایسا نہ تھا کہ ہم تھے زمانہ سے بے خبر
مانند گرد راہ ترے ساتھ ہم بھی ہیں — اے کاروانِ وقت اچٹتی سی اک نظر
ٹھہرے گا کس مقام پہ اب کاروانِ وقت — انجم تمام ہوگا کہاں زیست کا سفر

غزل

آنسوؤں میں جگمگائے، مرقد میں لہرائے ہم — زندگی تیرے لئے کچھ روشنی لے آئے ہم
پوچھتی ہے تم سے یہ بے خواب آنکھوں کی جلن — وہ جو اک خوابوں کی دولت تھی کہاں کھو آئے ہم
ذہن کی تنہا روی میں درد لو دینے لگا — کیا تمہارے شہر کی راہوں کو پھر یاد آئے ہم
وقت کی تیرہ شبی میں اس کی یادوں کا جمال — اک ستارہ تھا کہ جس کے ساتھ چلتے آئے ہم
ہر اندھیرے کو ضیا ہر سنگ کو آواز دی — زندگی ہے نام اس حد کا جہاں تک آئے ہم

پروفیسر کامل قریشی
دہلی یونیورسٹی دہلی

غزل

آیا ہے سر آنکھوں پر لوؤں کے جو غم تنہا دیکھا ہے اسے اکثر با دیدۂ نم تنہا
چل دیں گے جو دنیا سے مونس تھے ہم تنہا تڑپے گی قیامت تک تو اے شب غم تنہا
انساں ہیں کہ ہم نے ہر بار الم تنہا ہمسانہ کوئی ہوگا آسودۂ غم تنہا
خلوت میں بھی جلوت ہے جلوت میں بھی خلوت ہے تنہا تو نہیں ہوتے ہوتے ہیں جو ہم تنہا
ہم تم میں سمائے ہیں تم ہم میں سمائے ہو تم ہم ہو تو ہم تم ہیں تم تنہا نہ ہم تنہا
ہم ہی تھے رہ غم میں اک عمر گذار آئے چل کر تو کوئی دیکھے دو چار قدم تنہا۔

ڈاکٹر انجم الہدیٰ شعبۂ اردو فارسی بہار یونیورسٹی
ایس ایل کالج مظفرپور (بہار)

آگہی

یہ نظم شاعر نے اس وقت کہی جب وہ انجمن اساتذہ اردو کی سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کے لئے مظفرپور (بہار) سے بنگلور (کرناٹکا) جاتے ہوئے مدھیہ پردیش کے پہاڑوں جنگلوں اور سرنگوں سے گذر رہا تھا۔ یہ نظم بنگلور کے مشاعرے منعقدہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں سنائی گئی۔

یہ پہاڑ اور یہ صحرا کے سکوت
سلسلہ حد نظر تک جن کا
اے خدا ہے تری عظمت پہ گواہ
ان میں انساں کا گذر اور تحفظ کا یقیں

تیری رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری رحمت جو نہ ہوتی تو نہ ملتی جائے پناہ
رونق بزم حیات، آدمی، اشرف مخلوق
اپنی تدبیر پہ نازاں، پئے تسخیر جہاں
گامزن دوش ہوا پہ سوئے مریخ و قمر
کبھی تعمیر کا پیکر، کبھی تخریب کا روپ
ان گنت سوانگ رچائے، کئی بہروپ بھرے
خیر و شر اپنی طبیعت میں لئے
اپنے ہم جنس کا بھی دشمن ہے
تھوڑے سے فائدے کے واسطے اسفل جو بنا
اپنی پرواز کی رفعت پہ جو مغرور ہوا
خود کو سمجھا کہ ہے ہمسر تیرا
تیری ہستی سے بھی انکار کبھی اس نے کیا
بحر ظلمات میں جو یا وہ گذرگاہوں کا
عقل کا تیشہ لئے
ان کوہستانوں میں، صحراؤں میں جب در آیا
نقل و حرکت کیلئے راہ بنائی اس نے
اور پہاڑوں کے دلوں میں اترا
کبریائی کو تری اس نے کیا پھر تسلیم
تیرے جبروت کے آگے وہ ہوا سجدہ ریز

اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل صفحہ ۹۶ کا بقیہ

جیسا کہ آپ حضرات واقف ہیں، اردو ایم اے کی سند حاصل کرنے والے نوجوانوں کے سامنے روزگار کا صرف ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ اور وہ ہے کسی ہائی اسکول یا کالج میں اردو کا استاد ہو جانا۔ مگر اس روزگار کا دائرہ بھی اس قدر تنگ ہے کہ بہت سارے نوجوان یاسیت کا شکار ہو کر اردو کی اعلیٰ تعلیم کے فوائد سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اور جو سند حاصل کر چکے ہیں وہ بھی فطری طور پر دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ چند ایک ہونہار نوجوان جو تدریس کے علاوہ تحقیق کی جانب متوجہ ہوتے ہیں وہ بھی مستقل طور پر کوئی ملازمت یا وظیفہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ لہٰذا اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن یونیورسٹیوں میں اردو ایم اے کی تعلیم کے شعبے ہیں وہاں مستقل طور پر ریسرچ اسسٹنٹس کے دو یا تین طویل مدتی پوسٹ قائم کیے جائیں۔ تاکہ تحقیقی صلاحیت رکھنے والے سند یافتہ نوجوان فکر معاش میں مبتلا ہوئے بغیر ایک طویل مدت تک اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ علاوہ بریں عارضی طور پر کام کرنے والوں کے لئے بھی اتنے ہی پوسٹ قائم کیے جائیں۔ مگر اس سے قبل میں یہ کہنا چاہوں گا کہ خود اردو ایم اے کی جماعتوں کے نصاب کے اسکوپ کو حتی المقدور وسیع کیا جائے۔ تاکہ طلباء کے لئے دائرۂ روزگار وسیع ہو۔ عام طور سے ہمارے یہاں اردو ایم اے کے نصاب میں نو پرچے ہوتے ہیں جن میں نظم، نثر، ناول، ڈرامہ، تنقید، تاریخ ادب، فارسی اور خصوصی ادیب کا مطالعہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ تاریخ ادب اردو، اور خصوصی ادیب کا مطالعہ، بی اے میں اختیاری اردو کے مضامین کے ساتھ ضم کر دیے جائیں۔ اور صرف فارسی کے ایک پرچے کی بجائے فارسی عربی، یا فارسی ہندی یا فارسی کے ساتھ کسی مقامی زبان کو شامل کر کے اس کی تعلیم دی جائے۔ فارسی کے ساتھ جدید عربی، ہندی یا کسی دوسری زبان کے مطالعہ سے طلبا کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہوگا بلکہ ملازمتیں حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ دوسرا یہ کہ تاریخ ادب اردو کے بجائے عالمی ادب کا ایک پرچہ رکھا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اردو ایم اے کے طلبا انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور روسی زبانوں کے ادیبوں اور ادبی شاہکاروں سے براہ راست واقف ہو سکیں گے۔ اور ان کی ادبی معلومات، انگریزی ایم اے کے طالب علم سے کسی طرح کم نہ ہوں گی۔ تیسرا یہ کہ ڈرامہ کے پرچے میں فن ڈرامہ کے اصولی معلومات فراہم کرنے کے بجائے طلبا کو اگر ڈرامہ نویسی کی عملی تعلیم دی جائے اور اس کے لئے وقتاً فوقتاً مشہور ڈرامہ نویسوں کی خدمات حاصل کی جائیں تو طلبا کو اپنے طور سے ڈرامے پیش کرنے اور روزگار پیدا کرنے میں زبردست مدد ملے گی۔ چوتھا یہ کہ اردو ایم اے کی جماعتوں میں طلباء کو صحافت، مکالمہ نویسی، منظر نگاری، اسکرپٹ رائٹنگ اور

ریڈیو، فلم اینڈ ٹیلیویژن میں کسی ایک کی پیشہ ورانہ تعلیم طالب علم کے ذوق کے مطابق دی جائے اور اس کے لئے طالب علموں کو کسی پیشہ ورانہ ادارے یا فلم انسٹی ٹیوٹ میں ہر سال کم از کم دو یا تین ماہ کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی جائے تو اس کا مجموعی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو ایم اے کے طالب علم کے لئے روزگار کا میدان خود بخود وسیع ہوگا۔ اور اس کے لئے زندگی کے مختلف شعبوں میں ملازمت کے مواقع دوسرے امیدواروں کے مقابلے میں یقیناً بہت وسیع ہوں گے۔ اور اس کا مستقبل بھی یقیناً شاندار ہوگا۔

مزید برآں ایسی تعلیم کا سب سے اہم فائدہ، وہ خود اعتمادی ہوگی جس کی بدولت وہ زندگی کے کارزار میں اپنے طور سے آگے بڑھنے کی سعی کرے گا۔ کیونکہ اب وہ صرف مدرسی کے لئے امیدوار نہیں رہا بلکہ وہ یا تو اب صحافت کو اپنا ذریعہ معاش بنا سکتا ہے یا ڈرامے اسٹیج پیش کرکے اپنا روزگار کما سکتا ہے یا فلمی صنعت میں اپنی قسمت آزما سکتا ہے۔ اور اگر وہ مدرس بھی بن گیا تو اپنی معلومات اور صلاحیتوں کی بنا پر طلباء کو یقینی طور پر بہتر تعلیم دے سکے گا۔

مجھے امید ہے کہ اردو کے ارباب اقتدار میری پیش کردہ تجویزوں پر غور کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔ اور اگر وہ قابل عمل ہوں تو ان کو عملی شکل بھی دیں گے۔ ●●

به ثنای شهر بنگلور و دانش گاه آں

شهر بنگلور از دیار دکن
هم چون فردوس بر زمینے هست

مست خاکش همه گل خوشبو
از گل ترکه هم نشینے هست

برگ برگ چمن به خوش رنگی
می بنالد که گل چینے هست

هم ز نسرین و نسترن گوئی
به صبا بوئے یاسمینے هست

سایهٔ تاک و ابر گوهر بار
کوچهٔ زلف عنبرینے هست

همه کبریت احمرست این خاک
که هم از سیم و زر دفینے هست

روز روشن به شوخ رنگیها
خط از رنگ و نقش چینے هست

به شب تار هم به شمع و چراغ
مه وش کهکشان جبینے هست

هم به حسن ملیح خوبانش
دیده و دل به آفرینے هست

نازِ زلفش به شاخ گل ماند
که به آغوش نازنینے هست

چون غزالاں به ناز ذمت خرام
حسن با چشم شرمگینے هست

خوش لبیها به حرف و نغمه و شوق
شکر و شهد و انگبینے هست

به چراغاں و رقص و خوشبوها
شام بت خانهٔ حسینے هست

سجدهٔ در حرم همی خواهد
هر بتے کش در آستینے هست

قد دل جوئے سرو بستانش
چون نگاهے بلند بینے هست

آب کاویری و عذوبت آں
خوشتر از جرعهٔ زرّینے هست

باش تا سیر آں باغ کنیم
گر دلت خسته و حزینے هست

چه قدر خوش نصیب و خوش بخت است
آنکه این شهر را مکینے هست

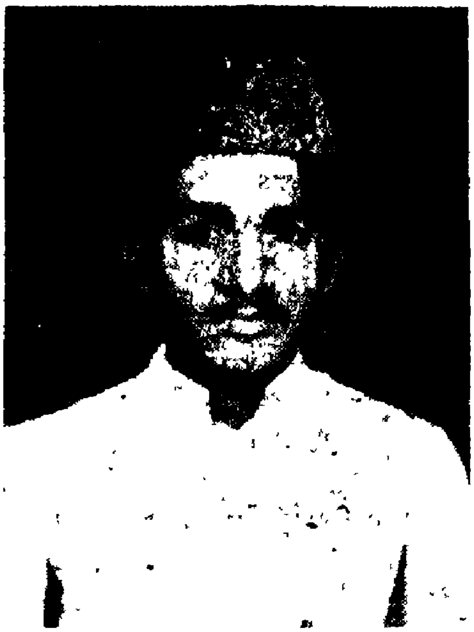
۵۸ چه قدر خوش سواد هست این شهر
مردماں را چه خوش قرینه هست
خاصه حسن سواد دانش گاه
هم چوں صبحے به گل زیلینه هست
داده او را سر شوق و وجداں
که ز لوح و قلم آئینه هست
نقشے از علم و عقل و دانش و داد
اندرو چوں مه نگینه هست
درتے کو بدل نگاشت ازیں
از همه مهر خوشه چینه هست
کوں از تشنگان دانشده
به رهش جاده سینه هست
حرفے از شنکر او را [illegible]
بدلش نقش چوں نگینه هست
هم چو [illegible] [illegible] دست رهبا ں
به شب تار [illegible] و کینه هست
هم ز مغرب ز روغ دیده اند
هم ز مشرق مآل بینه هست
هست سر خیل این گروه سعید
که به دانشوراں همینه هست
مرد دوربین نرسمہیا کو
خانه فقر را نگینه هست
آنکه در خاره زار عشق و وفا
هم چو رنگ لاله چمن نشینه هست

همه دانا و جذب و علم و عمل
این هم از دولت یقینه هست
هم بدیده چو خال مردم چشم
هم بدیا در نشینه هست
هر که دارد خلوص و صدق و صفا
اندرین ره [illegible] رهینه هست
ما همه [illegible] همه بپا به زینه هست
که همه زینت [illegible] سینه هست
آنکه زیبنده به مسند دانش
از شرف بوریا نشینه هست
همه در عجز و شوق و شیفتگی
خاک سجده که بر زمینه هست
صدر ذیشو [illegible] آمنه خاتون
که ادب داں و خوش قرینه هست
همه نازش بخدمت اردو
همه فخرش به فقره دینه هست
همه دختران ارض دکن
هم چو حرفے که دل نشینه هست
چه قدر خوش نفس بود آں کو
هم چوں صبح بهار بیلینه هست
هم به دانش شگفتن دلها
مثل دست صبا [illegible] هست
[illegible]
که سخن سنج و نکته سینه هست
نظم تنویر احمد علوی
که ز احباب کمترینه هست

پیش کرده: ڈاکٹر تنویر احمد علوی ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ شعبہ اردو دہلی کالج
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی۔

Urdu is therefore the language of affection and love, the language of tolerence, of an intercourse animated with good-will. It is large hearted and generous with the wealth it possses

" Khuda Hafiz "



Yours faithfully
R. ABDUL HAMEED,
Final M.A.
Bangalore University

Continuation of the report : Page 2 Line 6.

On August 1975 the Dept of urdu was shifted from Central college to New Campus Gnana Bharati at Manasa Bhavan and in the same month the association was inaugurated by Professor S. M. Yahya's (Honourable Minister for labour wokfs etc.) sister Mrs. Noourunnisa. She is a good speaker and a source of help in the running of schools and colleges at Bhatkal south Kannara. Our Vice Chancellor presided and Prof. M. E. Bharatraj Sing was the Chief Guest.

The department arranged a Nathiya Mushaira on the same day to celebrate Prophet Muhammad's birth day, Many of the well known local Poets participated.

On 27th March the junior's and the staff gave a grand party i.e. Send-off-Party to the first out going batch. Janab Moulvi Mohammed Khan Sahib, a great Urdu Scholar was the chief-guest of the function.

This year the Students both Juniors & Seniors of Urdu M. A. were benefitted by the leatures of the following teachers :—

Dr. Amina Khatoon, H.O.D.
Dr. Fahmida Begum—Full-time Lecturer.
Qadeer Imtiaz
Aneesul Haq
Md. Ibrahim
Waheedunnisa
} Part-time Lecturers

Miss Fathima Zohra received the subject scholarship for 1975-76 by securing First-rank in Jr. M. A. last year 1974-75.

Lastly I convey my best wishes to the first out-going batch of my brothers and sisters.

Let me disappear from your sight by telling you the words of Dr. Zakir Husain about the language, Urdu :—

I feel that this language Urdu is prophetic of the blossoming of the new life which we Indians desire for the country in the era of its freedom. As the Ganges and Jamuna together make one mighty stream a culture in which the beauty of the garden is seen to consist in the colourful multiplicity of flowers. A culture in which the flowers of varied hues can be strung together in a garland which if humanity wore it round its neck would make its beauty more glamorous and this spirit appears at its purest and clearest in Urdu.

1. Hafizullah Shariff
2. Noorullah Sharift
3. Firdose Fathima

} Sr M.A.

4. R. Abdul Hameed
5. Mahnoor Zamani

} Jr. M.A

On 22-2-1976 Dr. Amina Khatoon took all the students and the staff members of the department to Central Institute of Indian Languages Manasa Gangotari Mysore, after successfully handling the book on general linguistics. Zaban our Ilme-Zaban by Professor Sarvari, her teacher, She wanted to introduce and explain to the students the various recent techniques in determining the pronunciations and analysis of speech by the use of instrumental methods. The visit was prearranged and an expert from the Institute took us round and showed the working of the Instruments in the language study. We are obliged to the Institute for this.

After visiting the Institute we went to Brindavan-gardens as an excursion and enjoyed well and returned to Bangalore on the same night.

On 8th March "Iqbal Day" was Celebrated by the Urdu Association in Commonoration of the Centenary year of Iqbal. On the same day a book on Poet Iqbal: "Iqbal Aur Azmat-e Adam" written by our lecturer Sri Qadeer Imtiaz was released by Hon. Minister S M. Yahya. Dr. Ghulam Umar Khan, Reader Usmania University delivered an excellent lecture on poet Iqbal and Society. Our beloved Vice-Chancellor presided.

Annual Report of Urdu Association = 1975-76
Department of Urdu, Jnana Bharati, Bangalore University.

* * *

I feel a joy and a pride to present the annual report of Urdu Association. The year (1975-76) was the happiest and luckiest one for the Department Though it came into existence in 1974-75 but within a span of short time it has achieved much uccess and popularity with tne dynamic personality of Dr. Amina Khatoon as its head.

The department has already published " Au·aq-e-Baseerath froze Vol. I" and " Phool-ban " by Ibne-Nashati. The Department rose to the status of All India level when it arranged the VI All India University Urdu Teachers Conference during 26-28 October 1975. Eminent scholars and Professors of about 30 Indian Universities participated and held discussion on current burning topics. Advantageous resolutions were passed such a meet of great Urdu Scholars and eminent men was the first one on the soil of Karnataka Dr V. K R. V. Rao, Ex-Education Minister, Central Government inaugurated the conference the revered His Excellency Sri Mohanlal Sukhadia Governor of Karnataka delivered the Veledictory address. Our beloved Vice-Chancellor Dr. H. Narasimhaiah was the patron and the president of Reception Committee. The students and the teachers were greatly benefited by the Conference. The papers presented in the Conference with detailed report are presented in this Volume.

No elections were held for the Association due to Emergency but the following members were nominated as office-bearers by the Head of the Department.